

For More Urdu Books Please Visit:  
[www.pakistanipoint.com](http://www.pakistanipoint.com)

# میر دوست میر دشمن

[Waqar\\_Azeem@pakistanipoint.com](mailto:Waqar_Azeem@pakistanipoint.com)





علی اکبر چائے کی پیالی لے کر ہوٹل کے کونے میں بیٹھ گیا۔

یہ ہوٹل معمولی قسم کا تھا اور یہاں صرف چائے بکتی تھی۔ ادھر ادھر میزوں کے گرد ڈرائیور، کوچوان اور مزدور قسم کے لوگ بیٹھے چائے اور گھنیا سگریٹ پی رہے تھے اور تیز آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ علی اکبر ان لوگوں کی باتوں سے بے نیاز، اپنے اند و بکس خیالات میں غم چائے کی پیالی میز پر رکھے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ پاس ہی میز پر پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی ٹوکری پڑی تھی جو وہ اپنی سات آنٹھ سالہ بچی نغمہ کے لئے خریدا تھا۔ نغمہ سے علی اکبر کو بڑی محبت تھی۔ بچی اسکول میں پڑھتی تھی اور اپنے باپ سے بے حد پیار کرتی تھی۔ علی اکبر کی اس وقت عمر ساٹھ برس کے قریب تھی۔ وہ شہر میں ایک فلورل میں ڈیزل صدر روپے ماہوار پر منشی تھا۔ آج سے بیس برس پہلے علی اکبر ایک متمول زمیندار اور ایک دولت مند باپ کا بگڑا بیٹا تھا۔ اس کی پرورش اپنی زمینوں پر بڑے تاز و نعم میں ہوئی تھی۔ چھ چھ نوکر چاکر اس کے آگے پیچھے پھرا کرتے تھے۔ وہ اپنی فٹن میں بیٹھ کر سکول جایا کرتا تھا۔ ہر برس سالگرہ پر اس کے گلے میں سونے کا ہار ڈالا جاتا تھا۔ جب وہ جوان ہوا تو اس کا باپ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ماں پہلے ہی انتقال کر چکی تھی۔ علی اکبر اب لاکھوں کی جائیداد کا اکیلا وارث تھا۔ اس کے کوئی بھائی بہن نہ تھے۔ اس نے اپنے ارد گرد خوشامد

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے  
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو  
غالب

Waqar Azeem@pakistanipoint.com



وقت گزرتا گیا۔ علی اکبر کی محبت کا جنون حد سے آگے گزر گیا تھا۔ ادھر حسن اتفاق سے شیم طوائف کی ماں کو درگزر دو کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ ڈاکٹر نے آپریشن کا مشورہ دیا۔ بوڑھی طوائف کی موت قریب تھی۔ چنانچہ وہ آپریشن پر راضی ہو گئی۔ آپریشن ہوا اور وہ مر گئی۔ شیم اب طوائفوں کے طائفے میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اسے اپنا مستقبل تاریک نظر آیا۔ بغیر پاکٹ کے اسے اپنا جہاز ڈولنا نظر آیا۔ ادھر علی اکبر کی طرف سے شادی کے تقاضے شدید ہو گئے۔ آخر شیم نے علی اکبر سے شادی کر لی اور اس کے ساتھ کوٹھی سے اتر کر شہر سے باہر ایک کوٹھی میں آ کر رہنے لگی۔ یہ کوٹھی علی اکبر نے ایک سو روپے مہینہ پر خاص طور سے کرایہ پر لی تھی۔ یہاں علی اکبر کے چند ایک رسی دوستوں کے علاوہ احمد بھی شریک ہوا۔ احمد بھی شیم سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس کے دل میں ایک چھپا ہوا دروہ لہریں لے رہا تھا۔ لیکن اپنے دوست کی شادی میں وہ اس درد کو دل کی گہرائیوں میں چھپائے ہوئے تھا۔

علی اکبر کی شادی شدہ زندگی کا آغاز ہو گیا۔

اس کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ اس کے ہاں اولاد ہو مگر شادی کو پانچ برس گزر گئے اور شیم کو کوئی بچہ نہ ہوا۔ اس نے بہترے علاج کروائے مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

احمد اب لاہور میں وکالت کرنے لگا تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے علی اکبر کے ہاں آیا کرتا تھا۔ شیم کا دل علی اکبر سے بھر سا گیا تھا۔ اس کی کئی ایک وجوہات تھیں۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کبر کے پاس محمد دروہ پوپہ تھا اور وہ شیم کی ہر خواہش پوری نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شروع جوانی کی عیاشیوں نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی جھریاں پڑنے لگی تھیں۔ پینٹ باہر کو نکلتا تھا۔ بیٹائی کمزور ہو گئی تھی جسے اس نے سفید عینک لگا کر سنہال لیا۔ اس کے مقابلے میں شیم ابھی بالکل جوان تھی۔ اس کی عمر بمشکل بائیس برس کی ہوگی۔ علی اکبر کے جذبات کی بھیجی بھی سہ پڑ چکی تھی۔ وہ اب پہلے کی سی گرجوٹی کے ساتھ شیم سے اظہار

پرست اور بی حد ہنس مہکتا رہتا تھا۔ یہ لوگ اس کی بات پر داد دیتے تھے۔ انکے اور اسے ملتا اور اسے عہد حاضر کا سندر اعظم کہہ کر پکارتے تھے۔ علی اکبر خوشامد پرستی اور قیاس کے پیلا ب میں بہہ گیا۔ اس نے طوائفوں کے کوٹھوں پر دولت و دنوں باقیوں سے لے کر ناشروع کر دی۔ صبح سے شام تک اور شام سے رات گئے تک اسے وقفہ کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس طرح سیلاب کا پانی دریا کی طرح زمین کو اندر ہی اندر سے کاٹتا چلا جاتا ہے۔ اسی طرح عیاشی بھی انسان کے ضمیر کو اندر ہی اندر سے زنگ آلود کرنا شروع کر دیتی ہے۔ علی اکبر کے ساتھ بھی یہی المیہ ہوا۔ وہ عیش و عشرت میں نہ بھلے کی تمیز کھو بیٹھا اور اپنے مزارعوں پر ظلم و تشدد کرنے لگا۔

اس نے ان سے اپنی زمینوں پر زبردستی کام لینا شروع کر دیا وہ ہنر پھونکار کر ان سے زائد مال وصول کرتا۔ مگر آخر کہاں تک؟ طوائف کے کوٹھے پر روپیہ بارش کی بوندیں بن کر گرتا اور بھاپ بن کر اڑ جاتا۔ علی اکبر نے اپنی زمینیں فروخت کرنا شروع کر دیں۔ اس دوران میں وہ ایک مشہور طوائف شیم کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔ شیم کی جہاں دیدہ اور تجربہ کار ماں نے جب سوئی مرغی کو پھنستے دیکھا تو جی بھر کر اس کا مال کھایا۔ علی اکبر کی ساری زمینیں بک گئیں۔ گاؤں کے مکانات اور حویلی بھی طوائف کے سنگھاسن کی بھینٹ ہو گئی۔ علی اکبر نے شیم کو نہ بتایا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کی مفلسی کا حال سن کر شیم اس سے شادی نہیں کرے گی۔ اس کے باوجود اس کے پاس کوئی بیس پچیس ہزار روپیہ بینک میں موجود تھا۔ جب دولت کا دریا اترنے لگا تو سب دوست ایک ایک کر کے علی اکبر کا ساتھ چھوڑ گئے۔ صرف احمد اس کے ساتھ رہا۔ احمد اسی کے گاؤں کے ایک زمیندار کا لڑکا تھا اور لاہور شہر میں قانون پڑھ رہا تھا۔ یہ دونوں آپس میں بڑے گہرے دوست تھے۔ احمد بھی شیم سے محبت کرتا تھا اور علی اکبر کی ملاقات سے پہلے اس کا عاشق تھا۔ مگر جب اس نے اپنے دوست کو اس کی طرف زیادہ سی مائل التفات دیکھا تو اس نے ایک اچھے دوست ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہوئے شیم سے اپنے حرام ختم کر دیے۔



مشتی میں سوار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

اور وہ شمیم کی کشتی میں آ گیا۔

اب ان کی عشق و محبت کی ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ علی اکبر نے ایک قلمروں میں ڈیڑھ سو روپے کی ملازمت تلاش کر لی تھی۔ اس کی بیٹی نقاب سکول میں تعلیم حاصل کرنے لگی تھی۔ جس طرح باپ کو اپنی بیٹی سے امیدیں وابستہ تھیں کہ وہ پڑھ لکھ کر اپنا شریفانہ گھربسائے گی اور باپ کی لٹی ہوئی عزت کو ایک بار پھر بحال کرے گی اسی طرح نقاب کی ماں کی بھی اس پر نظریں تھیں۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر زندگی کے کسی مرحلے پر احمد نے بھی اسے چھوڑ دیا تو یہ لڑکی اس کے بڑھاپے کا واحد سہارا بنے گی اور اس کی زندگی کوتاہ ہونے سے بچالے گی۔

علی اکبر جس وقت بچی کو سکول رخصت کر کے کارخانے میں اپنے کام پر جاتا تو احمد وکیل گھر خالی پا کر شمیم کے پاس آ جاتا اور ان کی رنگ رلیوں کا باب کھل جاتا۔ ان کا گھر شہر کے شریف محلے میں تھا۔ اور شریف محلوں میں لوگ اس قسم کی باتوں کو کبھی گوارا نہیں کیا کرتے۔ لوگوں نے آپس میں چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ ہوتے ہوتے یہ بات علی اکبر کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ لیکن چونکہ اسے اپنے دوست احمد پر بڑا بھروسہ تھا اس لئے اسے یقین نہ آیا اور اس نے ایسی باتیں کرنے والوں کی سرزنش کی۔

”آپ لوگوں کو ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے احمد میرا دوست ہی نہیں میرا بھائی ہے۔ وہ ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتا اور میں اپنے بھائی کو اپنے گھر آنے سے کبھی نہیں روک سکتا۔ میری بیوی میرے دوست کی بھالی ہے اس پر میرے گھر کے دروازے کھلے رہیں گے۔“

لیکن ایسی باتیں زیادہ دیر تک نہیں چلا کر تیں۔ جس طرح مردہ لاش دریا میں گرتی ہی نیچے چلی جائے ایک نہ ایک روز پھول کر ضرور دریا کی سطح پر آ جاتی ہے۔ ایک روز علی اکبر کارخانے

مہیٹ نہ کرتا تھا۔ باہر سے آتا اور شراب پی کر سو جاتا۔

اس کی دولت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ ایک کاروبار میں اسے تیس ہزار لگایا اور سارے کا سارا برباد ہو گیا۔ علی اکبر کو بے حد صدمہ ہوا اور اس صدمے نے اسے اور بھی کمزور اور بڑھا کر دیا۔ اس کی عمر پچیس چالیس کے قریب تھی مگر وہ پچاس برس کا معلوم ہوتا تھا۔

اس کے مقابلے میں وکیل احمد جوان اور زندگی کی گرمی سے بھرپور تھا۔ علاوہ ازیں وہ شمیم سے محبت بھی کرتا رہا تھا۔ شمیم اس کی طرف پھیلنے لگی۔ شروع شروع میں تو احمد نے اسے اپنے دوست کی دوستی کا حوالہ دے کر اسے روکا۔ لیکن جب ایک جوان، زندگی کے گداز جذبات سے بھرپور حسین عورت اپنے شباب کی پوری رعنائیاں لے کر مرد کی طرف بڑھ رہی ہو تو انسان کا بیچ اٹھنا تقریباً محال ہو جاتا ہے۔ اس جنسی اشتعال سے تو کوئی پورن بھگت ہی اپنی جان سلامت لے کر نکل سکتا ہے اور چونکہ ہر مرد پورن بھگت نہیں ہو سکتا اس لئے قدرتی طور پر احمد اپنے دوست کی طوائف بیوی کے پسند سے میں آ گیا۔

اس اثنا میں شمیم کے ہاں ایک پیاری سی بیٹی پیدا ہو گئی۔ علی اکبر کو بے حد خوشی ہوئی۔ اس نے بیٹی کا نام نقاب رکھا اور اس کی پیدائش کی بڑی خوشیاں منائیں۔ بیٹی بڑھنے پھلنے لگی۔ علی اکبر کا کاروبار خراب سے خراب ہوتا گیا۔ اس نے شہر سے باہر والی کوٹھی چھوڑ دی اور شہر کے اندر ایک بوسیدہ سے مکان میں آ گیا۔ شمیم پریشان ہو گئی۔ وہ ذہنی طور پر اس معاشی زوال کے لئے بالکل تیار نہ تھی۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ اس کا خیال تھا کہ احمد وکیل سے شادی کر کے علی اکبر سے ہمیشہ کے لئے پیچھا چھڑا لے گی۔ چنانچہ اس نے علی اکبر سے بے رخی برتاؤ شروع کر دی اور احمد کو اپنے جال میں مزید پھانسنے کی ترکیبوں پر عمل کرنے لگی۔ وکیل احمد عجیب ذہنی پریشانی میں مبتلا تھا۔ ایک طرف اس کا پرانا دوست تھا اور دوسری طرف اس کی طرف اس کی پرانی محبت تھی۔ وہ دونوں کشتیوں میں پاؤں رکھ کر سفر کر رہا تھا اور اسے اپنی تباہی یقینی نظر آ رہی تھی۔ آخر اس نے ایک



سے بعدی گھر واپس آ گیا۔ اس روز اسے اور نام کے پیسے تھے۔ اس کی پتی قہر نے کہا تھا کہ اباجان مجھے پلاسٹک کی ایک نوکری ضرور لے دیں۔ میں اپنا سینے پر ونے کا سامان اس میں رکھوں گی۔ علی اکبر نے بازار سے ایک نوکری خریدی اور سیدھا گھر آ گیا۔

جب وہ گھر کی میز ہیاں چڑھ کر اوپر والے دروازے کے پاس آیا تو اسے اندر سے شمیم اور اپنے دوست احمد کی ہنس ہنس کر باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں وہ سکتے میں آ گیا اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا اور وہ بت بنا ہاں کھڑا ہا شمیم کھڑی تھی۔

”خدا کے لئے اب جانے بھی دو تم نے تو میرا اندھا حال کر دیا ہے اب تو ہونٹ بھی دکھنے لگے ہیں۔“

اور احمد کھڑا تھا۔

”میری جان محبت کے بوسے تو زندگی میں ایک بار ہی نصیب ہوتے ہیں۔ ان سے مت گھبراؤ۔ جوانی بار بار کر لوٹ کر نہیں آیا کرتی۔“

دروازہ کھول کر اندر جانے کی بجائے علی اکبر اپنی پتی نعمتی کی نوکری ہاتھ میں لئے نیچے اتر آیا۔ اس کا ذہن انتہائی پریشان تھا۔ آج اس کے اندر دوستی، محبت، بھرم اور خود اعتمادی کے سینکڑوں دیوتا اپنے اپنے چبوترے پر اوڑھے منہ گر پڑے تھے۔ اس نے دوستی کی لاش کو بھرے بازار میں خاک و خون میں لتھڑتے دیکھ لیا تھا۔ وہ چپکے سے ایک ہوٹل میں آ کر بیٹھ گیا۔

وہ اس وقت بھی ہوٹل کے کونے میں بیٹھا تھا اور پچھلے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ تو کیا واقعی اس کی بیوی اسے دھوکا دے گئی؟ کیا واقعی اس کے دوست نے اسی کے اعتماد کو ہلاک کر دیا؟ کیا دنیا میں وفا نام کی کوئی شے کہیں نہیں ہوتی؟

علی اکبر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کونے کی طرف منہ کئے رسی پر بیٹھا تھا۔ چائے میز پر پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ پلاسٹک کی نوکری اسے رحم آ کیس لگا ہوں۔ سے تک رہی تھی۔

اسے نوکری میں اپنی پتی نعمتی کی جھولی بھائی مسراتی ہوئی صورت دکھائی دی۔

”اباجان آپ میری نوکری لے آئے؟“

علی اکبر کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری لگ گئی۔ اس نے میری پتی کہہ کر نوکری کو سینے سے لگا لیا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ وہ ایک ہوٹل میں بیٹھا ہے۔ اس نے کوٹ کی جیب سے میلا سا رومال نکال کر آنکھیں صاف کیں۔ چائے کے پیسے میز پر رکھے نوکری اٹھائی اور تھکے تھکے قدموں سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں اچانک اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ ایسے لگا جیسے اس نے کوئی حیرت انگیز فیصلہ کر لیا ہو۔ وہ تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف چلنے لگا۔ وہ میز ہیاں چڑھ گیا۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور کہا۔

”شمیم دروازہ کھولو اور احمد تم بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔“

شمیم اور احمد پر گویا بجلی گر پڑی ہو۔ انہیں کبھی گمان بھی نہ گزرا تھا کہ علی اکبر کبھی اس طرح اوپر سے آ جائے گا۔ شمیم نے انتہائی چالاکی سے کام لیتے ہوئے احمد کو دوسری طرف نکل جانے کو کہا اور خود دروازے کی طرف بڑھی۔ علی اکبر سمجھ گیا اندر کیا ہو رہا ہے۔ شمیم نے اتنا کہتے ہوئے دروازہ کھولا۔

”تمہیں کبھی مجھ پر یقین بھی آئے گا یا نہیں۔ کہاں ہے احمد؟ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔“

لیکن میز ہیاں نیچے تک خالی تھیں۔ وہاں علی اکبر کہیں بھی نہیں تھا۔ دوسری طرف احمد وکیل جب دیوار پھانہ کر دوسری جانب کی غیر آباد گلی میں کودا تو اس کے سامنے علی اکبر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی زہر بھری مسکراہٹ تھی۔ احمد کا رنگ زرد ہو گیا اور اس کی آنکھیں اپنے آپ پٹی ہو گئیں۔

علی اکبر نے آگے بڑھ کر اپنے دوست کا ہاتھ تھاما اور کہا۔

”دوست جس گھر کا میں نے تم پر دروازہ کھول دیا تھا تمہیں اس گھر کی

دیوار نہیں پھانڈنے دوں گا۔ میرے ساتھ آؤ۔“

اور علی اکبر اپنے دوست احمد کو لے کر مکان میں آ گیا۔ جب شمیم نے اپنے خاوند کے

ساتھ اپنے آشنا کو بھی دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ ان کے خفیہ تعلقات کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا اور

اب وضاحتی بیانات کی گنجائش نہ تھی۔ علی اکبر نے احمد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ احمد کرسی پر بیٹھ گیا۔

”تم بھی بیٹھ جاؤ شمیم۔“

شمیم بھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس دوران میں نغہ بھی دوسرے کمرے سے بھاگ کر آ گئی

اور اپنے باپ کے ہاتھ میں پلاسٹک کی نوکری دیکھ کر خوشی سے لپٹ گئی اور بولی۔

”ابا جان آپ میری نوکری لے آئے ہیں ناں؟“

”ہاں بیٹی یہ نوکری۔“

باپ نے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے کہا۔

”تم اسے اپنی الماری میں رکھ آؤ بیٹا۔“

نغہ نوکری لے کر خوشی خوشی دوسرے کمرے کی طرف بھاگ گئی علی اکبر نے اپنے

دوست احمد کی طرف دیکھ کر کہا۔

”احمد تم میرے دوست ہو۔ میں نے تمہیں ہزاروں دوستوں میں سے چنا

ہے۔ تم سے جو کچھ ہوا مجھے اس کا قلق ہوا ہے۔ مگر مجھے تمہاری دوستی دنیا کی

تمام باتوں سے زیادہ عزیز ہے۔ تم پر میں نے اپنے گھر کے دروازے

کھول دیئے تھے۔ تم اس گھر میں ہمیشہ دروازے سے داخل ہوئے ہو اور

دروازے سے ہی واپس جاؤ گے۔ میں تمہیں اس گھر کی دیوار نہیں

پھانڈنے دوں گا۔ میں شمیم کو طلاق دیتا ہوں۔ آج سے یہ تمہاری بیوی

ہے۔ یہ گھر بھی تمہارا ہے۔ میں صرف اپنی بیٹی نغہ کو لے کر یہاں سے

جار ہوں۔“

احمد اور شمیم حیرانی سے علی اکبر کا منہ ہی تکتے رہ گئے۔ آخر جب درہ حالت سنبھلی تو احمد

نے بڑھ کر کہا۔

”مجھے معاف کر دو۔ دوست! مجھ سے غلطی ہو گئی۔“

علی اکبر نے مسکرا کر کہا۔

”اپنی محبت کو غلطی کے نام سے مت پکارو احمد! اگر ایک عورت سے چھپ

چھپ کر ملاقاتیں کی ہیں تو اسے مرد بن کر اب نبھاؤ۔ جس طرح کہ میں

ایک سچا باغیرت مرد بن کر اسے طلاق دے رہا ہوں۔ کیونکہ اب یہ میرے

لائق نہیں رہی۔ میں بے غیرت خاوند اور ذلیل مرد بن کر اب اسے اپنے

گھر میں نہیں بسا سکتا۔ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ اس کے خاوند کی غیر

حاضری میں اس سے ملنے آیا کرتے تھے۔ اب اس ذمہ داری کو سنبھالو اور

مرد بن کر اس کا ساتھ دو۔“

شمیم کی دلی نفرت باہر امنڈ آئی۔ اسے نے چیخ کر کہا۔

”ایک بار نہیں چاہے ہزار بار طلاق دے دو۔ میں خود تمہارے ساتھ نہیں

رہنا چاہتی۔ میں تم جیسے بڑھے کھوسٹ کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتی۔

لیکن تم میری بیٹی کو ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ وہ میرے پاس رہے گی۔“

علی اکبر نے طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”میں اپنی بیٹی کے گلے میں پھانسی کا پھندا دیکھ سکتا ہوں لیکن اس کے



پاؤں میں بے حیائی کے گھٹا نہیں دیکھ سکتا میں اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دوں گا مگر تمہارے ساتھ روانہ نہیں کروں گا۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تم اپنے آشنا کے ساتھ شادی کر کے ایک بار پھر اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرو۔ ورنہ میں تم دونوں کو اس وقت قتل بھی کر سکتا تھا۔

اتنا کہہ کر اس نے نغہ کو آواز دی۔ وہ بھاگتی ہوئی باہر آگئی۔ علی اکبر نے اس کی ماں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”بچی غور سے میری بات سنو! میں تمہاری ماں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہا ہوں۔ اب تم بتاؤ کہ تم اپنی ماں کے پاس رہنا چاہتی ہو یا میرے ساتھ جاؤ گی؟“

معصوم بچی حیرانی سے دونوں کا منہ دیکھنے لگی۔ پہلے تو وہ بھاگ کر اپنی ماں سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ شمیم کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ پھر جب علی اکبر نے ضروری اور معمولی سا اپنی ذاتی سامان سوٹ کیس میں باندھ کر بیڑیوں میں رکھا اور شمیم کو طلاق نامہ لکھ کر اس کے حوالے کیا اور باہر جانے لگا تو نغہ ”ابا جان“ کہہ کر ماں کی آغوش سے اپنا آپ چھڑا کر باپ کے پاس آگئی۔ علی اکبر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ احمد اپنے دوست کے پاؤں پر گر پڑا۔

”خدا کے لئے اپنا گھر یاد نہ کرو علی اکبر! مجھے معاف کر دو اور واپس آ جاؤ۔ واپس آ جاؤ۔“

شمیم نے گرج کر کہا۔

”ایک عورت کے سامنے اس بزدلی کا اظہار کرتے تمہیں شرم نہیں آتی احمد؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم میرے ساتھ یہاں سے بھاگ جانے کا

پروگرام بنا رہے تھے۔“  
علی اکبر نے مسکرا کر کہا۔

”رخصت! دوست! یہ داغ میرے دل میں سدا باقی رہے گا۔“

اتنا کہہ کر علی اکبر نے اپنی بچی نغہ کا ہاتھ تھاما اور سوٹ کیس اٹھا کر نیچے اترنے لگا۔ شمیم اپنی بچی کو پکارتی رہی۔ دو ایک بار نغہ نے بھی امی امی کہہ کر اسے آواز دی۔ لیکن باپ کا دامن نہ چھوڑا۔

سے پائی ٹپک رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ راستے میں بارشیں ہوتی ہیں۔ علی اکبر بڑی مشکل سے ایک ڈبے میں سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ غصے نے پوچھا۔

”ابا جان! ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

باپ نے آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو روک کر کہا۔

”کراچی جینا“

اور دل میں کیا جانے کہاں میری بچی! جانے اب قسمت کدھر لے جائے۔ زندگی کیا لیا رنگ دکھائے۔ ایک پردہ گر گیا ہے۔ دوسرے دن کا پردہ اٹھ گیا ہے۔ منظر ریل گاڑی کے چلنے سے شروع ہو رہا ہے۔ خدا جانے اس ایکٹ میں کیسے کیسے ہولناک منظر ابھی آئیں گے۔ کیسے ایسے جنگل عبور کرنے ہوں گے۔ کیسے کیسے جنگلی درندوں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ رات کہاں آئے گی؟ صبح کہاں ہوگی؟ بھوک کہاں لگے؟ کچھ معلوم نہیں!

گاڑی پلیٹ فارم سے کھسکتے لگی۔ علی اکبر نے اپنی بچی کے سر پر کمرشل اوڑھا دیا۔ سو جا! میری بد نصیب بچی! سو جا! تجھے بچپن میں ہی مصائب کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ اللہ تیری نگہداری کرے! سو جا! سو جا! میری معصوم بچی! گاڑی چلتی چلی گئی۔ بارش ہوتی رہی اور علی اکبر کی آنکھیں شام کے اندھیرے میں آنسو روتی رہیں۔

جب علی اکبر بچی کو لے کر گھر سے نکل گیا تو احمد نے آہ بھر کر سر اٹھایا اور کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ شیم نے اس کا سراپے ہاتھوں سے تھام لیا اور بولی۔

”اب جو ہوتا تھا ہو گیا۔ تم نے دوست کھو دیا۔ میں نے اپنی بیٹی کھو دی۔ ہم دونوں پریشان حال انسان ہیں۔ اپنی مشترکہ مصیبت پر رونے کی بجائے آؤں کر ایک دوسرے کی ذہارس بندھاؤں۔“

شیم نے احمد کا سراپے سینے سے لگا لیا۔ احمد کی آنکھوں سے آنسو

اس وقت شام ہو رہی تھی اور زہری کا آسمان ابر آلود تھا۔

علی اکبر اپنی بیٹی کو لے کر تانگے میں سوار ہوا اور اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ بڑی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اسٹیشن پر پہنچتے ہی بوند باندی شروع ہو گئی۔ علی اکبر نے اپنا گلوبند اتار کر اپنی بیٹی کے گلے کے گرد لپیٹ دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مگر اس نے مسکرا کر بچی کو دیکھا۔

”سردی نہیں لگتی ناں؟“

”نہیں ابا جان“

نغمہ کی آواز آنسوؤں میں ڈوب کر ابھر رہی تھی۔ باپ نے بچی کو اپنے ساتھ لگایا اور سوٹ کیس پاس رکھ کر ایک بیچ پر بیٹھ کر کراچی جانے والی ریل گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ بوند باندی نے اب بارش کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اسٹیشن کی چھت پر بارش نے شور مچا رکھا تھا۔ پلیٹ فارم پر مسافر کمرل اور چادریں لپیٹے بیٹھے تھے۔ ٹھنڈی ہوا فرارے بھر رہی تھی۔ علی اکبر نے بچی کو گرم گرم چائے پلائی اور اسے اپنی گود میں خوب گرم کر کے بٹھالیا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد پشاور سے کراچی جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر آ کر ٹھہری ہو گئی۔ گاڑی کی چھت بھٹی ہوئی تھی اور بون



اپنا چہرہ شمیم کے سینے میں چھپالیا اور اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ شمیم بڑی خوش ہوئی کہ اس کی چال کامیاب ہو گئی تھی اور احمد ٹھیک راستے پر آ گیا تھا۔ وہ بھی احمد سے لپٹ گئی۔ اس نے احمد کو اٹھا کر چنگ پر لٹا دیا۔ خود اس کے پاس بیٹھ گئی اور جھک کر اس کا منہ چومنے اور اسے پیار کرنے لگی۔ اچانک اسے اپنی بیٹی کا خیال آ گیا۔ اس نے احمد کے سینے پر سر رکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کسی گہری سوچ میں اتر گئی۔ پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں امید کی چمک تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ غم کو بہت جلد واپس بلا لے گی۔

شمیم نے اٹھ کر الماری کھولی۔ اس کے اندر شراب نصف سے کچھ کم بوتل پڑی تھی۔ شمیم نے شراب گلاس میں ڈال کر احمد کو دی۔

”لو اپنا وقتی غم غلط کرو اور سب کچھ بھول جاؤ۔ میرے پاس بیٹھ کر سب غم بھلا دو۔ تم دوست کے غم کو اس گلاس میں غرق کرو اور میں اپنی بیٹی کے غم کو غرق کرتی ہوں۔“

شمیم نے ایک گلاس اپنے لئے بنایا۔ احمد نے گلاس تمام کر اس میں غور سے دیکھا اور پھر ہونٹوں سے لگا کر غٹا پٹی گیا۔ دوسرا گلاس شمیم نے بھی خالی کر دیا۔ اچانک احمد اٹھا۔ اس نے الماری میں سے شراب کی بوتل اٹھا کر کھڑے میز پر پھینک دی۔ ایک چھتا کے ساتھ بوتل ریزہ ریزہ ہو گئی۔ شمیم گھبرا کر احمد سے لپٹ گئی۔

”میری جان! میرے احمد!“

احمد چنگ پر گر پڑا اور سسکیاں بھرنے لگا۔ وہ رات بھر کبھی روتا رہا اور کبھی اپنے آپ کو ملامت کرتا رہا۔ شمیم بڑی ہوشیاری سے اس کی دلجوئی کرتی رہی۔ اس نے اسے اپنی بھرپور محبت کا یقین دلایا اس نے کہہ دیا کہ وہ شروع ہی سے احمد سے پیار کرتی تھی اور اسی سے شادی کرتا چاہتی تھی۔ علی اکبر اسے پھسلا کر لے گیا تھا۔ اب خدا کا شکر ہے کہ اتنی دیر بعد اس کے دل کی مراد بھرا آئی

اس کا محبوب اسے دوبارہ مل گیا۔ حقیقت میں شمیم اب کسی قیمت پر احمد کو نہیں کھونا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ احمد کیم عتول آمدنی ہے۔ اس نے ایک کوٹھی کرائے پر لے رکھی ہے اور وہاں اکیلا رہتا ہے۔ اس کا سوائے ایک بڑی بہن کے دنیا میں کوئی نہیں اور یہ بہن سیالکوٹ میں کسی فوجی انفری بیوی ہے اور احمد سے بڑا پیار کرتی ہے اور احمد اگر چاہے تو اسے راضی کر سکتا ہے۔ اس طرح شمیم بڑے آرام اور سکون کے ماحول میں رہ کر اپنی بیٹی کو واپس لانے کے پروگرام پر عمل درآمد کر سکتی تھی۔

دوسرے روز احمد نے عدالت میں جا کر شمیم سے باقاعدہ شادی کر لی اور اسے اپنی کوٹھی میں لے آیا۔ اس نے اس کا ذکر اپنی بڑی بہن سے بالکل نہ کیا۔

”میں اسے کچھ روز کے بعد بتانا چاہتا ہوں۔ ہم اکٹھے سیالکوٹ جائیں گے اور اسے ساری بات کا خود بخود علم ہو جائے گا۔“

شمیم بڑی خوش ہوئی ہر بات اس کی عین خواہش کے مطابق ہو رہی تھی۔ احمد کے ساتھ نئی کوٹھی میں رہتے ہوئے جب ایک ہفتہ گزر گیا۔ تو احمد اسے ساتھ لے کر سیالکوٹ اپنی بہن کے گھر روانہ ہو گیا۔ احمد کی بڑی بہن کا نام جمیلہ تھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب تھی۔ چھ سات بچے تھے۔ اسے خاوند کیپٹن مشتاق کے ساتھ انتہائی پرسکون اور باقاعدہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ انتہائی روشن دماغ، روشن ضمیر اور عقلمند عورت تھی۔ اپنے اکیلے بھائی احمد سے بڑا پیار کرتی تھی اور اس کے دکھ سکھ کا بڑا خیال رکھا کرتی تھی۔ جب اس نے احمد کے ساتھ کوٹھی کے برآمدے میں داخل ہوتے دیکھا تو اٹھ کر بھائی کو گلے لگا لیا اور عورت کی طرف دیکھ کر بولی۔

”بھائی! تم نے بیاہ بھی کر لیا اور مجھے خبر بھی نہ دی۔“

شمیم نے جمیلہ کو سلام کر کے سر جھکا لیا۔ احمد نے بہن سے کہا۔

”حالات کچھ ایسے ہی تھے آپ کو خبر نہ دے سکا۔ پھر بتاؤں گا۔ بھائی جان

”ریلوے میں بہت بڑا فسر۔“

جیلہ نے پوچھا۔

”اس لڑکی کی اور بہنیں بھی ہیں؟“

احمد گھبرا تا جا رہا تھا جیلہ عورتوں کی طرح ایسے حالات پوچھ رہی تھی جن کے جواب

احمد نے پہلے سے تیار نہیں کئے تھے۔ اس نے یونہی کہہ دیا۔

”ہاں دو بہنیں ہیں۔ شادی شدہ ہیں۔ ریلوے کے افسروں سے بیای

ہوئی ہیں۔“

”لاہور چل کر انہیں ملیں گے“

احمد نے جلدی سے کہا۔

”کاش ایسا ہو سکتا۔“

”کیوں؟“

”لڑکی کے باپ نے شمیم کو اپنے خاندان سے الگ کر دیا ہے۔ ابھی نیانیا

صدمہ ہوا ہے اسے میرا خیال ہے کچھ عرصے بعد وہ بھول جائے گا اور میل

ملاقات شروع ہو جائے گی۔“

شمیم اور احمد کوئی تین روز جیلہ آپا کے ہاں ٹھہرے۔ چوتھے روز وہ لاہور واپس

آ گئے۔ ان کی گھریلو زندگی ایک خاص ڈھب پر چل نکلی۔ احمد عدالت جاتا۔ دفتر جاتا۔ دن بھر محنت

مزدوری کرتا اور شمیم گھر میں اکیلی بیٹھی۔ کبھی رومانی ناولیں پڑھتی کبھی برآمدے میں کرسی ڈال کر

بیٹھ جاتی اور سڑک پر سے گزرنے والوں کا نظارہ کرنے لگتی اور کبھی تانپورہ اٹھا کر کوئی راگ یا غزل

کا کر جی بھلانے لگتی اسے ہر گھڑی اپنی بیٹی نغمہ کا غم دکھا رہتا۔ نغمہ اس کی زندگی کی سنہری کرن اور اس

کے مستقبل کا سہارا تھی۔ وہ اسے کسی قیمت پر بھی نہیں کھو سکتی تھی۔

کہاں ہیں؟“

”دفتر میں ہیں۔ ابھی آ جائیں گے۔ آؤ اندر چل کر بیٹھو۔“

جیلہ نے شمیم کو بیار سے بٹھلایا۔ نوکر چائے اور پھل لے آیا۔ چائے کے دوران

مشاق صاحب بھی آ گئے۔ احمد سے گلے لگ کر ملے۔ شادی کا سنا تو مبارکباد دی۔ شمیم کو ایک

ایک روپے کی سلامی دی اور گلہ کیا کہ شادی پر انہیں کیوں نہ بلایا۔ احمد نے پراسرار طریق پر

معذرت کر دی۔ رات کو جب شمیم کھانے کے بعد جیلہ کے بچوں سے کھیل رہی تھی تو جیلہ نے

اپنے بھائی سے پوچھا۔

”اب مجھے صاف صاف بتاؤ کہ یہ شادی کیسے ہوئی؟ ایسی کون سی افتاد

آپڑی تھی کہ تم نے شادی پر اپنی بہن کو بٹھلادیا۔ کیا میری زندگی میں یہ خوشی

بار بار آئی تھی؟“

احمد نے ذرا کھٹک کر کہا۔

”بات یہ ہے آپا کہ میں نے محبت کی شادی کی ہے۔ لڑکی کا باپ اول تو

راضی ہی نہ ہوتا تھا۔ جب وہ راضی ہوا تو اس شرط پر کہ آدھ گھنٹے کے اندر

اندر شادی کر کے لڑکی کو لے جاؤ میں مجبور ہو گیا۔ اب اس وقت آپ

لوگوں کو کیسے اطلاع کرتا۔ پھر یہ بھی خیال تھا کہ اگر شادی کے انتظامات

میں لگ گیا تو کہیں لڑکی کے باپ کا ارادہ ہی نہ بدل جائے۔ بس یہ افتاد

آپڑی تھی۔“

جیلہ نے بڑی متانت سے پوچھا۔

”لڑکی کا باپ کون ہے؟“

احمد یہ سوچا ہی نہ تھا۔ کچھ گھبرا سا گیا۔ پھر جلدی سے سنبھل کر بولا۔



”کہو! کہو! میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں“

شیم نے علی اکبر سے طلاق، نفقہ کی جدائی اور احمد کے دوبارہ شادی کی تمام تفصیلات ماسٹر کو سنا ڈالیں۔ آخر میں کہنے لگی۔

”اب مجھے سب سے زیادہ دکھ اپنی بچی نفقہ کا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ شخص میری بیٹی کو لے کر کراچی گیا ہے میں آپ کو کراچی اس کے دوستوں کا ایڈریس اور یہ دوسورہ پے دیتی ہوں۔ آپ کراچی جائیں اور میری بیٹی کا سراغ لگا کر آئیں۔“

ماسٹر ذرا ہچکچایا۔ مگر شیم نے دوسورہ پے کے دونوں اس کے سامنے میز پر رکھ دیئے۔ ماسٹر نے نوٹ قمیض کے اندر صدری میں رکھتے ہوئے کہا۔

”بائی جی میں آج ہی کراچی چلا جاتا ہوں۔ میں نفقہ کا سراغ لگانے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔“

”امید ہے آپ ایک ہفتے تک واپس آ جائیں گے؟“

”ضرور ضرور کیوں نہیں آؤں گا۔ اچھا اجازت دیجئے“

اتنا کہہ کر ماسٹر نے سلام کیا اور کونٹھی سے باہر نکل گیا۔ نوکر اسے جاتے ہوئے بھی مشتبه نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اگرچہ شیم نے نوکر کو اپنے اعتماد میں لے لیا تھا لیکن شام کو جب میں احمد وکیل کو چائے دینے ان کے کمرے میں گیا تو اس نے مشتبه آدمی کا ذکر کر دیا۔ احمد فائل کھولے پنسل سے اس پر نشانات لگا رہا تھا۔ وہ رک گیا۔

”اس کا حلیہ کیا تھا؟“

نوکر نے سارا حلیہ بیان کر دیا۔ احمد سمجھ گیا کہ ماسٹر سارنگی والا آیا تھا۔ اسے اس بات سے بے حد رنج ہوا کہ شیم نے ابھی اپنی پرانی زندگی کو یکسر فراموش نہیں کیا تھا اور اس نے چوری

ایک روز احمد عدالت میں گیا ہوا تھا۔ کونٹھی میں وائے نوکر اور شیم کے اور کوئی نہیں تھا کہ برآمدے میں کسی نے گھنٹی بجائی۔ شیم نے کھڑکی کی جالی میں سے جھانک کر باہر دیکھا اور نوکر سے کہا۔

”صاحب کو اندر بٹھلاؤ“

یہ صاحب اندر دیوان خانے میں آ کر بیٹھ گئے بوکی کی قمیض اور سفید تہبند میں ملبوس تھے۔ کالے چہرے پر چمک کے داغ تھے اور سر پر میلی سی قراقلی کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ نوکر نے اسے مشتبه نگاہوں سے دیکھا اور چائے کا ٹرے رکھ کر باہر نکل گیا۔ شیم نے اندر آ کر دروازہ بند کر دیا وہ مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہو گیا۔ شیم نے ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔

”بیٹھے ماسٹر جی بیٹھے“

اس آدمی کی عمر پچاس کے قریب تھی اور وہ شیم کے ہیرا منڈی کے زمانے میں اس کے ساتھ سارنگی بجایا کرتا تھا۔ ماسٹر نے پوچھا۔

”بائی جی! اس ناچیز کو کس طرح یاد کیا آج؟“

شیم نے آہ بھر کر کہا۔

”ماسٹر جی! یہاں کی زندگی راس نہیں آئی مجھے۔“

ماسٹر نے چمک کر کہا۔

”تو پھر واپس چلی چلو۔ تمہارے بغیر کوٹھا بھی اداس ہے۔ میں نے ایک اور لڑکی کو لا کر بٹھلادیا ہے مگر ایسی اناڑی ہے کہ چھ سال ہو گئے ایک بھی بول نمیک سے نہیں گا سکتی۔“

شیم نے کہا

”واپسی کا تو پھر کبھی سوچیں گے۔ ابھی میں نے آپ کو ایک خاص مقصد

کے لئے بلایا ہے۔“

چھپی اپنی چھپی بے حیا زندگی سے متعلق برقرار رہا ہوا تھا۔ اب رات کو اس نے شیم سے مانسے بارے میں استفسار کیا تو پہلے تو شیم مکرنگی پھر کہنے لگی۔

”میں نے اپنی بچی کی محبت کے لیے سب کچھ کیا تھا احمد۔ میں کیا کروں۔

نفخہ کے بغیر مجھے چین نہیں پڑتا۔ میں نے مانسے سے پوچھا تھا کہ کہیں انہوں نے میری بیٹی کو تو کہیں نہیں دیکھا۔“

احمد نے کہا۔

”مانسے کو نفخہ کا کیا علم ہو سکتا ہے بھلا؟“

شیم نے جھٹ کہا۔

”وہ لوگ اکثر کراچی آتے جاتے رہتے ہیں اور علی اکبر بھی کراچی گیا ہوا ہے۔“

احمد نے سگریٹ راکھ دان میں بجھا کر کہا۔

”بہر حال آئندہ سے یہ لوگ میرے گھر نہ آئیں۔ اگر پھر میں نے ایسی

بات سنی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔“

شیم منہ ہی منہ میں بڑبڑ کرتی باہر نکل گئی۔ وہ نوکر کو نکال نہ سکی لیکن اس نے اس پر سختی شروع کر دی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر نوکر کی جان مصیبت میں پھنس گئی۔ وہ عاجز آ گیا اور اس نے کام چھوڑ دیا۔ شیم نے اپنی پسند کا ایک نوکر رکھ لیا۔

مانسے سارنگی والے نے بانی جی سے دو سو روپے لے کر سب سے پہلے چرس خریدی۔

پھر ہسکی کی ایک قمیض، دو تہبند اور دو پپ شو خریدے۔ مہینے بھر کا گھر میں راشن ڈالا اور سارنگی کو نے میں رکھ کر چرس پانی پر لیٹ گیا اور دو دن تک سوتا رہا۔ دوسرے روز شام کو اٹھ کر اس نے غسل کیا۔ سیر بھر گوشت بازار سے لا کر پکایا۔ کھایا۔ چرس بھر کر پی اور پھر سو گیا اور حسب معمول ایک رات اور نصف دن سو یا رہا۔ کوئی ہفتہ بھر اس نے چرس پیئے، گوشت کھانے اور سونے کا سلسلہ

جاری رکھا۔ آٹھویں روز روٹھسی صورت بنا کر شیم کی گونجی پر آیا۔ شیم اسے دیکھ کر بے تابی سے آئی اور اپنی بچی کا پوچھا۔ مانسے نے غم زدہ لہجے میں کہا۔

”بائی جی! کراچی کا کون کونہ جھان کر آ رہا ہوں۔ کوئی گلی کوئی بازار، کوئی

ہوٹل نہیں چھوڑا۔ دوستوں سے بھی ملا۔ سب نے اطمینان کا اظہار کیا۔ علی

اکبر اپنے کسی دوست کے پاس نہیں ٹھہرا۔ خدا جانے وہ کہاں ہے میرا تو

خیال ہے شو بانی وہ کراچی نہیں گیا۔“

شیم نے سر جھکا لیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ مانسے بھوت بک رہا ہے۔ وہ کراچی نہیں گیا

اور لاہور میں ہی بیٹھا اس کے روپوں کی دعوتیں اڑاتا رہا ہے۔ مگر وہ اسے سوائے اس کے کچھ

نہ کہہ سکی۔

”آپ کا شکر یہ مانسے جی! اب میں خود وہاں جا کر اپنی بچی کو تلاش کرنے

کی کوشش کروں گی۔“

”مجھے افسوس ہے بانی جی میں آپ کا کام نہ کر سکا۔“

”کوئی بات نہیں۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔“

مانسے سارنگی والا چلا گیا۔ رات کو جب احمد گھر میں آیا تو اس نے معمول کے مطابق نوکر

سے راز داری میں پوچھا کون آیا تھا؟ نوکر نے جس آدمی کا حلیہ بتایا احمد سمجھا گیا کہ سارنگی والا

مانسے پھر آیا تھا۔ لیکن اس نے شیم سے کوئی بات نہ کی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ شیم کا راہ راست پر

آنا ناممکن ہے۔ وہ ماں بن کر اگر اپنی بچی کی تلاش شروع کرتی تو احمد اس کا ساتھ دیتا۔ ظاہر ہے

ایسی حالت میں اسے احمد کو اپنے ساتھ ملا کر بچی کی تلاش شروع کرنی چاہیے تھے۔ لیکن اس کی

جگہ اس نے مانسے سارنگی والے کی خدمات حاصل کی تھیں جس سے ظاہر تھا کہ وہ ناکد بن کر اپنی

بیٹی کی جستجو میں تھی۔ احمد نے فیصلہ کر لیا وہ شیم کو اپنی زندگی سے خارج کر دے گا۔



پندرہ گانے شروع کر دیے۔ لیکن ہفت بھرتی در بدری ہے۔ جو دکامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ لہٰذا پندرہ روز کے بعد خدا کر کے اس شہر سے چھ سات میل دور ایک پڑے کے کارخانے میں مزدوروں کے منشی کی نوکری مل گئی۔

علی اکبر نے اللہ کا شکر ادا کیا اور نوکری پر حاضر ہو گیا۔ تنخواہ وہی ایک سو پچاس روپے مہینہ تھی۔ اس نے کارخانے کے منیجر سے بدن رکھ رکھا۔ میں ہی اپنے لئے ایک کوارٹر حاصل کر لیا۔ وہ ہوٹل سے اٹھ کر نوکری کے ساتھ اس کوارٹر میں آ کر رہنے لگا۔ دن بھر وہ نوکری پر رہتا۔ اس دوران میں نوکری اپنے کوارٹر میں رہتی اور کبھی اٹھ کر اپنے باپ کے پاس ورنہ شاپ میں آ جاتی۔ دوپہر کو علی اکبر اپنی بیٹی کے ساتھ کارخانے کے ہوٹل کے باہر گھاس پر بیٹھ کر روٹی کھا کر خدا کا شکر ادا کرتے۔ زندگی ایک بڑے ہی جفا طلب اور سخت کوش انداز میں بسر ہوتے گئی۔ علی اکبر کو اپنا کوئی غم نہ تھا اس اگر دکھ تھا تو اس بات کا تھا کہ اس کے ساتھ معصوم بچی بھی تکلیف اٹھا رہی تھی۔ یہ دن اس کے لاڈ پیار اور دنیا جہان کی نعمتیں کھانے کے تھے۔ اور یہی ایام وہ مصیبت اور انتہائی غریبی میں بسر کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ والے کوارٹر میں ایک مزدور کا کنبہ رہتا تھا۔ مزدور کی بیوی نے باپ بیٹی کا حال دیکھ کر بڑا محسوس کیا اور اپنے خاوند سے کہا کہ بے چارہ باپ بیٹی کی وجہ سے پریشان رہتا ہے۔ اسے کہو کہ یا بچی ہمارے ہاں رکھ جایا کرے اور یا یہاں سے صبح شام کھانا کھالیا کرے۔ چنانچہ علی اکبر راضی ہو گیا۔ دو ہر ماہ ایک خاص رقم اس مزدور ساتھی کو دے دیتا اور دن میں دو بار باپ بیٹی وہاں سے روٹی کھالیا کرتے۔ انہیں اس عورت کے ساتھ بڑی مل گئی اور دن بھر اس کے بچوں سے کھیلتی رہتی۔

علی اکبر بیٹی کی طرف سے کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔ اس نے مہینے کی پہلی تاریخ کو بچی کے لئے کپڑوں کا نیا جوڑا بنوایا۔ اسے نئے جوڑے خرید کر دیئے۔ اب اسے فکر ہوئی کہ نوکری کو تعلیم دلوانی چاہیے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس نے نوکری کو ایک قریبی سکول میں داخل کروا دیا۔ یہ سکول

کارخانے کے پاس ہی تھا۔ باپ کا رخا نے میں آ جاتا اور نوکری سنبھال کر باپ کا پیار لے کر سکول روانہ ہو جاتی۔ باپ اسے سکول کے اندر داخل کر کے کارخانے میں آ جاتا۔ دوپہر کی پھٹی کے وقت وہ خود جا کر بچی کو اسکول سے ساتھ لے کر گھر آتا اور اسے اپنے ہمراہ بان بھائی کے حوالے کر کے پھر کارخانے میں آ جاتا۔ دن اسی طرح گزرنے لگتا۔ پڑھائی میں بڑی ترقی ہوئی۔ ایک سال میں دو جماعتوں کا امتحان دے کر پانچویں جماعت میں آں داخل ہوئی۔ اوپر علی اکبر کو بیس روپے ترقی مل گئی۔ کارخانے، کوارٹر، سکول اور ارد گرد کے ماحول میں علی اکبر اور اس کی بیٹی نوکری رہ رہی گئی اور انہوں نے زندگی کا گرجوٹی سے مقابلہ شروع کر دیا۔

اس ایک برس میں جب ہم واپس لاہور شیم کے گھر آتے ہیں تو وہاں کی فضا کو تہہ و بالا پاتے ہیں۔ شیم کے لچھن شروع دن ہی سے اٹھنے نہ تھے۔ احمد وکیل سے ایذا کٹ ہو گیا تھا۔ اب اس نے اپنی کار بھی خرید لی تھی۔ مگر شیم کی طرف سے اس کا جی بھر گیا تھا اور اس نے اسے طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دونوں کے درمیان تقریباً دوسرے تیسرے روز بگلی سی جھڑپ ہو جاتی تھی۔ شیم اسے دوست سے بے وفائی کا طعنہ دیتی اور اٹھ کہتا۔

”تم اپنے اتنے اچھے خاوند کی نہیں بن سکیں میری کیا بنو گی۔ مجھ سے کیسے نباہ کر و گی؟ تمہارے خیر میں ہیرا منڈی کی منی ہے یہ منی تمہیں ایک دن پھر وہیں بھیج کر لے جائے گی۔“

شیم کو آگ لگ جاتی۔ وہ غصے میں احمد کو فٹس گالیاں کہنے لگتی۔ احمد کان لپیٹ کر باہر نکل جاتا۔ احمد کچھ روز اور اس کے ساتھ گزارہ کر لیتا کہ اس کی بہن جیل کو معلوم ہو گیا کہ اس کے بھائی نے ایک طلاق یافتہ عورت سے شادی کی ہے۔

اس نے تاروے کر احمد کو سیالکوٹ بلوایا اور سارا معاملہ سامنے رکھ دیا پہلے تو احمد ٹال مٹال کرتا رہا۔ پھر اس نے ساری کہانی کھول کر بیان کر دی۔ جیل سنانے میں آ گئی اس نے کہا۔

”بھائی جو عورت اتنے اچھے خاوند سے نباہ نہ کر سکی جس نے ایسے نیک آدمی کو ٹھکرا دیا وہ تمہاری کیا پرواہ کرے گی۔ ابھی تو اکیلی جان ہے۔ خدا نہ کرے اولاد ہو گئی تو کیا کرو گے۔ کیا خاندان کے نام کو اس کے خون کو گندا کرنے کا ارادہ ہے۔ میری مانو اور اس چھنال کو طلاق دے کر گھر سے باہر کرو۔ میں تمہاری شادی بڑی اچھی جگہ اپنے ہاتھوں کروں گی۔ خیر سے مرزا صاحب کی تین بیٹیاں ہیں شکل و صورت میں ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔“

احمد نے جب مرزا صاحب کی نو جوان، پڑھی لکھی، خوبصورت اور کنواری لڑکیوں کا ذکر سنا تو اسے شمیم ایک فاحشہ طوائف کے روپ میں نظر آنے لگی۔ اس کے تمام عیوب پہلے زیادہ شدت کے ساتھ نمایاں ہو گئے۔ اس نے بہن سے کہا۔

”اگر تمہارا یہی خیال ہے آیا تو میں کل ہی لاہور جا کر اسے طلاق دے دیتا ہوں۔“

بہن نے کہا۔

صرف میرے کہنے پر ایسا نہ کرو۔ تم خود سوچو کیا میں تمہیں صحیح مشورہ نہیں دے رہی؟ کیا تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ذرا اپنے خاندان کا سوچو کہ ہمارے ماں باپ کس قدر شریف اور وضع دار تھے۔ کیا تمہیں مناسب ہے کہ تم اپنی اولاد یعنی ہمارے والد صاحب کے پوتے ایک طوائف سے پیدا کرو۔“

دوسرے روز احمد لاہور آ گیا۔ اب وہ طلاق کے بہانے تلاش کرنے لگا۔ اتفاق سے

شمیم نے ایک روز پھر ماسٹر سارنگی والے کو بلایا اور اس سے پرویز کا پوچھا۔ پرویز ایک مشہور دلال

تھا جو شمیم کی والدہ کے وقتوں سے ان کے ہاں رہا کرتا تھا۔ ادھیڑ عمر کا دبلا پتلا بد معاش آدمی تھا۔ رات کو شراب میں دھت ہو کر وہی تباہی بکا کرتا اور دن بھر بو سکی قمیض پر سونے کے فین لگائے لٹھے کی شلوار اور چپل پہنے ان کے کونٹے کے نیچے چار پائی پر بیٹھا رہتا۔ وہ اس علاقے میں کوئی پندرہ بیس لڑکیوں کو لاکر تباہ کر چکا تھا۔

ماسٹر سارنگی والا شمیم کو یہ بتانے آیا کہ پرویز ان دنوں کراچی میں ہے وہ دیوان خانے میں شمیم کے ساتھ بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا کہ اوپر سے احمد آ گیا۔ اس نے غصے میں سارنگی والے کو اور شمیم کو دیکھا اور پوچھا۔

”آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟“

شمیم نے کہا۔

”انہیں میں نے بلایا ہے۔ یہ میرے مہمان ہیں کیا اس گھر پر میرا کوئی حق نہیں؟“

”میں اپنے گھر میں رنڈیوں کے دلالوں کو آنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ شریف آدمی کا گھر ہے۔ کسی طوائف کا کوٹھا نہیں ہے۔“

”میں اسے طوائف کا کوٹھا سمجھتی ہوں۔“

احمد نے طیش میں آ کر شمیم کے منہ پر طمانچہ مار دیا۔ شمیم تڑپ کر دور جا پڑی۔ اس نے چونک اٹھا کہ احمد پرویز ماری۔ ماسٹر نے جب گھر میں جنگ مہا بھارت چھڑتی دیکھی تو کان لپیٹ کر وہاں سے نکل بھاگا۔ احمد نے اسی وقت شمیم کو طلاق لکھ کر ہاتھ میں پکڑا دی۔

”نکل جاؤ میرے گھر سے آج سے تم میری بیوی نہیں ہو۔“

”میرا اس ہزار روپے حق مہر لاؤ۔“

”جا کر عدالت میں دعوے دائر کرو۔ اس کا فیصلہ عدالت میں ہوگا اور میں



بھوسوں کا کہ تم میں طرح بھجھ سے حق مہر وصول کرتی ہو۔

شیم نے نوکر کو بلا کر اپنے کپڑے، زیورات اور مختصر سامان تیار کروایا اور ٹیکسی منگوا کر احمد کو گالیاں دیتی وہاں سے نکل گئی۔ احمد نے اطمینان کا سانس لیا۔ شند سے پانی کے پورے دو گلاس پئے اور اپنے دونوں کمروں میں تالہ ڈال کر چابی نوکر دے کر دفتر میں آ گیا۔

شیم ٹیکسی میں سوار ہو کر سیدھی ہیرامنڈی اپنے پرانے گھر پر آ گئی۔ اسے سامان کے ساتھ واپس آتا دیکھ کر دوسری طوائفوں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ کچھ زیر لیب مسکرائے لگیں۔ دو ایک نے آوازے بھی کسے۔ مگر شیم چپکے سے کونٹے پر چڑھ گئی۔ وہاں کالے میاں ڈانس ماسٹر اور اچھن خان کا بیگ ایک نئی لڑکی کو رقص اور گانے کی تعلیم دے رہے تھے۔

انہوں نے شیم کو دیکھا تو لپک کر خیر مقدم کیا۔ اگرچہ شیم اب وہ پہلے کی سی جوان و خوبصورت اور آہوشتم شیم نہیں تھی۔ جب وہ اس کونٹے سے اتر کر گئی تھی تو اس کے انگ انگ سے جوانی پھوٹ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شباب کی تازگی تھی۔ آنکھوں میں جوانی کا جادو تھا۔ بدن میں گرمی اور گداز پن تھا۔ آج وہ نو برس کے بعد واپس آ رہی تھی۔ اس کا شباب ڈھلنے لگا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے نمودار ہو گئے تھے۔ جسم بوجھل ہو کر بھڑا ہو گیا تھا۔ پھر بھی انہوں نے بڑی گرجوٹی سے شیم کا خیر مقدم کیا۔ کیونکہ شیم ایک جہاں دید و طوائف تھی اور اس کی موجودگی میں کونٹے کا کاروبار ایک بار پھر چمک سکتا تھا۔ کالے میاں اور اچھن خان سمجھ گئے تھے کہ مجھو بائی کو خیر سے طلاق ہو گئی ہے۔ مگر انہوں نے شادی شدہ زندگی اور طلاق کے بارے میں شیم سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ کالے میاں نے فوراً چائے منگوائی۔ اچھن خان نے سامان اندر کمرے میں لگا دیا۔ شیم نے اندر آ کر پرانا کمرہ دیکھا۔ سنگار میز وہیں پڑا تھا۔ کانس کے اوپر اس کی ماں مچھیا بائی کی تصویر ویسے ہی لگی تھی۔ شیم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”مجھو بائی جی! لانا بھی چائے کے ساتھ ہی منگوائوں!“

”نہیں کالے میاں! سف چائے منگوانا!“

”بہت اچھا بائی جی!“

کالے میاں نے اچھن خان کو آنکھ ماری اور خود چائے لینے باہر نکل گیا۔ نئی لڑکی نے غور سے مجھو کو اور مجھو نے بڑی گہری اور تیز نگاہوں سے نئی لڑکی کو دیکھا۔ نئی لڑکی کا ہسم شند اپڑ گیا۔ اچھن خان نے بتایا کہ ”اس کا نام زینت بائی ہے۔ ابھی دو روز ہوئے کراچی سے آئی ہے۔“

”بہت خوب“ شیم نے اداسی سے کہا اور ایک پل کے لئے خاموش رہ کر بولی۔

”اچھن خان جی! کراچی ہمیں بھی چلنا ہوگا“

اچھن خان نے سر ہلا کر کہا۔

”چلے چلیں گے مجھو جی“

کالے میاں چائے لے کر آ گیا۔ چائے کے دوران زینت نے ناچنا شروع کر دیا۔ مجھو بائی نے بڑی حاسدانہ نگاہوں سے زینت کی طرف دیکھا اسے خیال آیا کہ یہاں اس کی بیٹی نونہ کو ہونا چاہیے تھا۔ پھر اس نے ایک پل کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

شیم عرف مجھو کو کونٹے پر واپس آئے ایک مہینہ گزر گیا۔ اس اثنا میں اس نے اپنے اڈے کو پھر سے مشہور کر لیا تھا۔ مگر وہ کراچی جانا چاہتی تھی۔ اس کی نظر اپنی بیٹی پر تھی۔ اس نے اچھن سے بات کر کے اسے صاف صاف بتا دیا کہ وہ کراچی چل کر آباد ہونا چاہتی ہے اور ہر حالت میں اپنی بیٹی کو اپنے پاس لانا چاہتی ہے۔ اچھن خان نے کہا۔

”مجھو جی یہ بھی کوئی مشکل کام ہے۔ کراچی چل کر پرویز باؤ سے بھی مدد

لیں گے۔ وہ دو سال سے وہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے میں پرویز سے بھی ملوں گی۔ میں اس سے مدد بھی لوں گی۔ مجھے

یقین ہے کہ میں اپنی بیٹی واپس لے کر آؤں گی۔“

”انشاء اللہ بائی جی“

چنانچہ چھمو بائی نے ضروری سامان، زیورات اور نقدی ساتھ لی اور کونٹھا کالے میاں کے حوالے کر کے اچھن خان کے ساتھ کراچی روانہ ہو گئی۔ کراچی پہنچ کر انہوں نے پیر روز کی بجائے صدر بازار میں ایک فلیٹ کرایہ پر لے لیا اور اچھن خان کو پرویز کی تلاش میں روانہ کر دیا۔ شام کو اچھن پرویز کو ساتھ لے آیا۔

پرویز نے چھمو بائی کو دیکھ کر بڑی محبت سے اسے گلے لگایا اور منہ چوم کر بولا۔  
”میری جان! تم تو بالکل ڈھل گئی ہو۔ کیا ہو گیا تمہارے ساتھ؟ شادی کر کے تو تمہاری رہی سہی جوانی بھی دریائے دہو گئی۔“

چھمو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر چونکہ بڑی حوصلہ مند عورت تھی۔ فوراً سنبھل گئی۔  
”مسکرا کر بولی۔“

”پرویز میں نے تمہیں ایک ضروری کام سے بلایا ہے۔“  
پرویز نے مسکرت کاش لگا کر کہا۔

”ہم حاضر ہیں جناب عالی! ساری عمر آپ لوگوں کی خدمت کرتے آئے ہیں۔ اب بھی خدمت کر دیں گے۔“

چھمو بائی نے پرویز کو الف سے لے کر یے تک ساری داستان سنا ڈالی۔ پرویز بڑے غور سے اس کی داستان سنتا رہا۔ سچ سچ میں کبھی حیرت سے منہ میں انگلی ڈال لیتا اور کبھی مسکرا دیتا۔ جب شیم یعنی چھمو بائی اپنی کہانی سنا چکی تو پرویز نے ہنس کر کہا۔

”بس میری جان اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا میری جان! سارا کراچی اپنے اعذر ہے اس وقت شہر کے کونے کونے میں تمہارے غلام کے جاسوس کام کر رہے ہیں۔ میری صرف ایک آواز لگانے کی دیر ہوگی کہ کراچی شہر نوک کو جہاں کہیں وہ ہوگی اگل کر رکھ دے گا۔“

چھمو بائی کی جان میں جان آ گئی۔ وہ پرویز کی مکاری اور طاقت کو جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اب نفد اسے واپس مل جائے گی۔ پرویز نے گل جھاڑ کر کہا۔  
”لیکن ذرا اللہ کر سرنی پاؤ ذرا لگاؤ۔ شراب منگواؤ۔ کچھ رقص کرو کچھ گاؤ تم۔“  
ابھی اتنی بوڑھی تو نہیں ہو چھمو۔ ابھی تو جوان ہو میری جان۔“

چھمو نے اچھن خان کو سو روپے دیئے کہ شراب وغیرہ لے آئے۔ خود انھہ کر غسل کیا۔  
نئے کپڑے پہنے۔ بناؤ سنگار کیا اور اپنی زندگی کا بالکل نیا چولا پہن کر پرویز کے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔ پرویز نے اسے گلے سے لگالیا اور اس کے بو سے لینے لگا۔

چھمو اچھل کر پرے ہٹ گئی۔

”اوئی اللہ! تم میرا سارا پیٹ خراب کر رہے ہو۔“

پرویز نے مسکرا کر کہا۔

”میری جان کسی پینٹر سے نیا پیٹ کروادیں گے۔ لو اب اس جام میں

ساتی بن کر شراب ڈالو۔“

شراب کا دور چلنے لگا۔ اچھن خان، پرویز اور چھمو تینوں نے مل کر پی جب نشہ چڑھ گیا۔ تو چھمو نے تان پورہ اٹھایا۔ اچھن خان نے طلبہ سنبھالا اور غزل چھیڑ دی۔

آنکھوں آنکھوں میں پلا دی میرے ساتی نے مجھے

اب نہ شیشے کی ضرورت ہے نہ پیانے کی

”واہ واہ! جیو چھمو جی جیو“ پرویز نے گلے سے ہار اتار کر چھمو بائی کی طرف اچھال

دیا۔ یہ محفل عیش و طرب رات کے بارہ بجے تک جاری رہی۔ پھر اچھن خان وہیں طلبے کے پاس پڑ کر سو رہا۔ پرویز نے چھمو کو گلے لگایا اور دوسرے کمرے میں لے جا کر اسے پٹنگ پر لٹایا اور خود بھی اس کے ساتھ لیٹ کر سو گیا۔



نے نیل لی طرح کام کر رہا ہے۔ راتوں وادور نام لگاتا ہے۔ اور بچی کو پڑھا لکھا رہا ہے۔ اس کی آسائش اور تربیت کا ہر طرح سے خیال رکھ رہا ہے۔ وہ اس کی ماں کے ماضی کو اس کی زندگی سے یکسر نکال کر باہر پھینک دینا چاہتا تھا۔

ایک روز نذر کو اسکول سے چھٹی تھی۔ وہ بارہ بجے تک تو اپنی بھائی کے گھر رہی اور ایک بجے اپنے باپ کی روٹی لے کر کارخانے میں آگئی۔ علی اکبر نے جب بیٹی کو روٹی کا ذبہ ہاتھوں میں تھا سے ورکشاپ میں آتے دیکھا تو اسے بڑھ کر پیار کیا اور روٹی کا ذبہ پاس رکھ لیا اور کام کرنے لگا۔ جب چھٹی کا گھنٹہ ہوا تو وہ بھی دوسرے مزدوروں کے ساتھ کارخانے سے باہر آ گیا۔ دونوں باپ بیٹی ایک جگہ درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے۔ بیٹی باپ کی بڑی فرماں بردار تھی۔ اس نے ڈبہ اٹھا کر کہا۔

”اباجان! پانی لاتا تو میں بھول ہی گئی۔“

”ہاں بیٹی نکلے سے جا کر ڈبہ بھر لاؤ۔“

نذر ڈبہ لے کر نکلے کی طرف آگئی۔ جہاں علی اکبر درخت کے سائے میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہاں وہ اپنی جانب کارخانے کی دیوار تھی۔ دیوار کے عقب میں پانی کا قفل لگا تھا اور قفل کے سامنے شہر کی طرف جانے والی بڑی سڑک تھی جس پر کاریں اور بسیں دن بھر گزرتی رہتی تھیں نذر قفل پر آ کر ڈبے میں پانی بھرنے لگی۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ سڑک کے کنارے سیاہ رنگ کی ایک کار کھڑی تھی۔ جس کا ایک دروازہ کھلا تھا اور ڈرائیور مشیرنگ پر بیٹھا بار بار باہر دیکھ لیتا تھا۔

ابھی نذر پانی کا ڈبہ بھر کر واپس ہوئی تھی کہ کسی نے پیچھے سے آکر اس کے منہ پر کسبل ڈال دیا اور کندھے پر ڈال کر کار کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ نذر نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ مگر اس کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔ دوسرے اس پر کسبل پڑا تھا۔ اس کی آواز اندر ہی دب کر رہ گئی۔ اس آدمی نے ایک منٹ کے اندر اندر نذر کو کار میں ڈال دیا۔ دروازہ بند کیا اور کار سارے ہو کر پوری رفتار

پر پرویز کا پرانا دستور تھا کہ وہ کسی بھی عورت کا کام کرنے سے پہلے ایک رات اس کے ساتھ ضرور رہ کر رہتا تھا۔ ایک بھر پور رات بسر کرنے کے بعد صبح اس نے نہادھو کر کپڑے پہنے اور منہمو سے اجازت لے کر اپنے کام پر روانہ ہو گیا۔

اس نے اپنے ”ہیڈ کوارٹر“ جا کر تمام ”کارندوں“ کو جمع کیا اور علی اکبر اور نذر کا حلیہ بتا کر شہر کے کونے کونے کی طرف روانہ کر دیا۔ اس کے بعد وہ خود بھی ایک خاص علاقے کی طرف نکل گیا۔ دو روز بعد پرویز کے ایک جاسوس نے آکر اطلاع دی کہ اس نام کا آدمی شہر سے باہر کپڑے کے ایک کارخانے میں اپنی بیٹی کے ساتھ رہ رہا ہے۔ پرویز نے اس کی اطلاع منہمو کو کر دی۔ شمیم کو جب معلوم ہوا کہ پرویز نے اس کی بیٹی کا سراغ لگا لیا ہے۔ تو خوشی سے اس کا چہرہ چمک اٹھا اور گئی ہوئی جوانی واپس آگئی۔ پرویز نے کہا۔

”منہمو جی! اس خاکسار کے سامنے سارا شہر پانی بھرتا ہے تم ہوائی جہاز

میں سوار ہو کر کسی کونے میں ایک سوئی گرا دو اور میرے پاس آ جاؤ۔ ایک

گھنٹے کے اندر اندر سوئی تمہیں واپس لا دوں گا۔“

منہمو نے خوش ہو کر کہا۔

”مجھے تم سے یہی امید تھی پرویز میں اسی لئے تمہارے پاس آئی تھی۔ مجھے

یقین تھا کہ تم یہی کام کر سکتے ہو۔“

پرویز نے منہمو کی ران پر تھاپی مار کر کہا۔

”پھر شراب منگواؤ اور تان پورہ اٹھاؤ۔“

اس روز بھی رات گئے تک شراب و شعر کی محفل برپا رہی اور پرویز نشے میں ذہت ہو کر

منہمو کے پہلو میں ہی سو گیا۔ منہمو بھی نشے میں تھی اسے بھی تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

اب ہم واپس علی اکبر کے کوارٹر میں آتے ہیں۔ بے چارہ علی اکبر اپنی بچی کے لیے کولہو

لی گئیں۔ جھاڑی میں چاندی کی ایک انگوٹھی پڑی ملی۔ پولیس نے انگوٹھی کو بھی اپنے قبضے میں کر لیا۔  
تھانے میں رپورٹ درج ہو گئی۔ پولیس نے ضمنی بھری اور تفتیش کا کام شروع ہو گیا۔  
یہ تو دفتری اور قانونی کارروائی تھی۔ مگر ان سے علی اکبر کے دل کی حالت نہ سن سبیل  
سکی۔ اس کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اس کی بچی اب اسے کبھی واپس  
نہیں ملے گی۔

سے سڑک پر بھاگنے لگی۔

علی اکبر نے کھانا کھاتے محسوس کیا کہ نعرہ کو دیر ہو گئی ہے۔ نکلے تو بالکل پاس ہی لگا  
ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید نکلے پر بھیڑ لگی ہو۔ جب مزید دیر ہو گئی تو اس کا دل دھڑکنے  
لگا۔ یونہی اسے وہم سا ہوا اور روٹی وہیں چھوڑ کر اٹھا اور بھاگ کر نکلے کی جانب آیا۔ مگر وہاں تو  
کچھ بھی نہیں تھا۔

نعرہ کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ صرف پانی کا خالی ڈبہ فرش پر اوندھے منہ پڑا تھا۔  
علی اکبر سنانے میں آ گیا۔ اس نے فوراً ڈبہ اٹھایا اور اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر اس نے ادھر ادھر  
نعرہ کو پاگلوں میں کی طرح آوازیں دینی شروع کر دیں۔  
نعرہ! نعرہ! میری بچی نعرہ! کہاں ہو میری بیٹی؟

وہ چاروں طرف اپنی بیٹی کو آوازیں دیتا پھرا۔ تلاش کرتا پھر اسارے مزدور اس کے  
ساتھ ہو گئے۔ ہر کوئی اس کے ساتھ اداس اور پریشان ہو گیا تھا۔ سارے کارخانے میں ایک دم شور  
مچ گیا کہ منشی علی اکبر کی بچی نعرہ کو کوئی اٹھا کر لے گیا۔ کارخانے کا منیجر فوراً جائے واردات پر پہنچ گیا۔  
اس نے دیکھا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے علی اکبر کو حوصلہ دیا۔

”گھبراؤ نہیں منشی جی! میں ابھی پولیس کو اطلاع کئے دیتا ہوں پولیس آپ  
کی بچی کو فوراً تلاش کر لے گی۔“

علی اکبر اداس اور ویران لگا ہیں جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی دنیا ہی لٹ گئی تھی۔ اس کی  
آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی رواں تھی۔ وہ ہچکیاں لے لے کر بچوں کی طرح رو رہا تھا اور اپنی بیٹی  
کو آوازیں دے رہا تھا۔

کارخانے کے منیجر نے اسی وقت پولیس کو اطلاع کر دی۔ تھوڑی دیر بعد پولیس کا ہیکار  
وہاں آ گئی۔ موقع واردات کا معائنہ کیا گیا۔ سڑک پر کار کے نشانات موجود تھے۔ ان کی تصویریں



پرویز کے ایجنٹ نغمہ کو کار میں ڈال کر جب شہر سے باہر والی ویران کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئے تو شمیم اور پرویز برآمدے میں بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ جب کار انہوں نے کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھی تو لپک کر اس کی طرف بڑھے۔ شمیم نے آگے بڑھ کر اپنی بیٹی نغمہ کو گلے لگالیا۔ اس وقت وہ ماں تھی۔ ماں \_\_\_\_\_ جس کی بیٹی ایک عرصے کے بعد دوبارہ اس کے سینے سے لگ رہی تھی۔ نغمہ رو رہی تھی اور اپنے باپ کو پکار رہی تھی۔ ماں کے سینے سے لگ کر اسے کچھ تسلی ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے اسے اس کا باپ مل گیا ہو۔ وہ ماں کے گلے لگ کر ہلک کر رونے لگی۔ شمیم اسے گلے سے لگائے اندر لے گئی۔ اندر اس نے اسے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھایا۔ اس کے آگے منھائیاں اور دودھ کا گلاس رکھا۔ نغمہ نے دودھ پیا۔ منھائی تھوڑی سی کھائی اور ایک بار پھر اپنے باپ کو بلایا۔ شمیم نے کہا۔

”میری بیٹی! تمہارے ابا جان شام کو آ جائیں گے۔ فکر نہ کرو میں بھی

تمہاری ماں ہوں۔ کیا تم اپنی ماں کے پاس آ کر خوش نہیں ہو؟“

شمیم نے نغمہ کا ہاتھ چومنا شروع کر دیا۔ معصوم بچی کو حوصلہ ہو گیا کہ وہ اپنی ماں کے پاس

جینھی سے۔ شمیم نے منہ ان سے سارا چٹک بھر دیا تھا۔ وہ تھوڑا سا خوش ہوئی۔ چابی والی

ریل کار جب اس پر چھنے لگی تو نغمہ کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ شمیم نے اطمینان کا سانس لیا۔

بد نصیب باپ بیٹی کی جدائی کے بعد بے حال ہو گیا۔ اسے نوکری کی بھی سندھ باندھ نہ رہی۔ اس نے کارخانے سے دور روز کی چھٹی لی اور شہر میں اپنی بیٹی کی تلاش شروع کر دی۔ وہ دن بھر مارا مارا شہر کی سڑکوں پر پیدل پھرتا اور جہاں کہیں بچوں کا گروہ نظر آتا بھاگ کر وہاں آتا اور اپنی بیٹی کو وہاں نہ پا کر مایوس ہو کر آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھتا آگے چل پڑتا۔ غم نے اس کا اندھا حال کر دیا تھا۔ اس کے پاؤں کراچی کی لمبی شاہراہوں پر پھر پھر کرسوج گئے تھے۔ اس در بدری میں ایک مہینہ گزر گیا۔ اس کی بیٹی اسے نہ مل سکی۔ پولیس نے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا مگر نغمہ کا کہیں کھوج نہ لگ سکا۔ ہوشیار اور تجربہ کار پرویز نے نغمہ کو ایسی جگہ چھپا رکھا تھا کہ اس کی ہوا تک کسی کو علم نہ ہو سکتا تھا۔

علی اکبر سے نوکری چھٹ گئی تھی۔ اب وہ بے کار تھا۔ بد حال تھا۔ غم زدہ تھا اور اس کا کام سارا سارا دن شہر کے باغوں، سڑکوں اور سینما گھروں کے باہر کھڑے رہ کر اپنی بیٹی کو تلاش کرنا تھا۔ لیکن پورا ایک برس گزر گیا اور اس کی بیٹی اسے واپس نہ مل سکی۔ اس ایک برس میں علی اکبر بڑھا نظر آنے لگا۔ اس کے بال کئی جگہوں سے سفید ہو گئے۔ بدن ڈبلا ہو گیا۔ چہرے پر جھریاں پڑ گئیں اور آواز میں نقاہت آ گئی۔

ایک روز وہ ایک ٹیکسی والے سے رو رو کر اپنا دکھڑا بیان کر رہا تھا کہ ڈرائیور نے اس سے ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

”میاں یوں کب تک بچی کی تلاش میں اپنی زندگی برباد کرتے پھر گے

تمہیں ڈرائیوری تو آتی ہے۔ پھر کیوں کسی جگہ ڈرائیور نہیں ہو جاتے۔

اس طرح تمہیں روزگار بھی مل جائے گا اور تم گاڑی میں بیٹھ کر اپنی بچی کو

آسانی سے تلاش کر سکو گے۔“

علی اکبر نے آہ بھر کر کہا۔

”نوکری بھی تو نہیں ملتی۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی بھائی۔ اگر تم کسی جگہ مجھے روزگار دلوا سکتے ہو تو ضرور دلوا دو۔“

ڈرائیور نے کہا۔

”سوسائٹی میں ایک سینٹھ صاحب ہیں۔ ہیرے جواہرات کا کام کرتے

ہیں۔ جوان آدمی ہے۔ سنا ہے کہ اسے کسی ڈرائیور کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں ایڈریس دیے دیتا ہوں۔ تم وہاں جا کر قسمت آزمائی کرو۔ مگر ذرا خلیہ ٹھیک بنا کر جانا۔“

علی اکبر نے ایڈریس لیا۔ ان دنوں وہ شہر کے ایک بوسیدہ محلے کی ایک اندھیری کوٹھڑی میں رہا کرتا تھا۔ یہاں آکر اگلے روز اس نے حجامت بنوائی اب اس نے داڑھی رکھ لی تھی۔ داڑھی کا غلط بنوایا۔ غسل کیا دھلے ہوئے کپڑے پہنے اور خدا کا نام لے کر سینٹھ کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت وہ شکل و صورت سے بڑا شریف مولوی سالک رہا تھا۔ سفید بال، داڑھی میں بھی بالوں کی سفید لڑیاں، پختہ مگردہ سا چہرہ، منحنی بدن، دھلی ہوئی شلوار اور گھر میں ہی دھلی ہوئی چار خانہ قمیض اور پاؤں میں مرمت شدہ جوتا اور کندھے پر ہنستی رنگ کا عربی رد مال!

بس میں سے اتر کر لوگوں سے پتہ دریافت کرتے کرتے علی اکبر کو مزید ایک میل پیدل چلنا پڑا۔ آخر وہ اس کوٹھی کے گیٹ پر پہنچ ہی گیا جہاں اسے نوکری ملنے کی امید تھی۔ جوانی کے زمانے میں علی اکبر بڑا ریش ڈرائیور رہا تھا اور شراب پی کر دوستوں کے ساتھ لالہ لالی سڑکوں پر پچاس میل فی گھنٹہ سے کم وہ کبھی نہ چلا تھا۔ جب اس پر آفت کے دن آئے تو اس نے اپنے ڈرائیونگ کے لائسنس کی تجدید کروا لی تھی۔ کراچی آکر اس نے اس خیال سے بھی ڈرائیوری کی

نوکری حاصل نہ کی کہ وہ ہر وقت اپنی بیٹی نذر کو کار میں ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اور وہ کسی دوسرے پر لڑکی کے بارے میں بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ اب اس کی بیٹی اس کے پاس نہیں رہی تھی۔ اب اسے ایسی نوکری کی ضرورت بھی تھی۔ کراچی کی لمبی سڑکوں پر وہ گاڑی میں بیٹھ کر اپنی بیٹی کو زیادہ آسانی سے ڈھونڈ سکتا تھا۔ گیٹ کے باہر ایک چوکیدار کھڑا تھا۔ اس نے اسے سنا، کیا اور اپنا مقصد بیان کیا۔ چوکیدار نے کہا۔

”یہاں ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔ ابھی صاحب باہر ٹھپٹیں گے تو ان سے بات کر لینا۔“

علی اکبر ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ جب وہ کھڑے کھڑے تھک گیا تو وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد اندر سے نیلے رنگ کی ایک لمبی کار باہر نکلی۔ علی اکبر نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ کار میں ایک پتلی پتلی موچنوں والا چمچک زدہ بد صورت کالا سیاہ مگر جوان آدمی بیٹھا سرگٹ پی رہا تھا اور کار بھی چلا رہا تھا۔ اس نے کار روک لی اور سر کھڑکی سے باہر نکال کر پوچھا۔

”کیا چاہے ہو میاں؟“

”حضور ڈرائیور ہوں۔ نوکری چاہتا ہوں۔ آپ کے بچوں کو دعا دوں گا۔“

وہ آدمی دروازہ کھول کر کار سے باہر نکل آیا اور علی اکبر کے پاس آ کر بولا ”میاں شکل و صورت سے تو تم شریف آدمی معلوم ہوتے ہو۔ یہ ناؤ تمہیں گاڑی چلانے کا تجربہ بھی ہے؟“

علی اکبر نے دل میں کہا کہ اب میں اسے ایسا بتاؤں کہ جب میں اس کی طرح جوان تھا تو میرے پاس اس سے بھی زیادہ بڑی اور قیمتی کار تھی اور پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی چلایا کرتا تھا۔ اس نے کہا۔



”حضور! میں برس سے گاڑی چلا رہا ہوں۔ لائڈ میں تھا۔ وہاں جن صاحب کے پاس تھا انہوں نے اب خود موٹر چلانا شروع کر دی۔ اس لئے کراچی چلا آیا۔ سوچا بڑا شہر ہے۔ نوکری ملنے میں دیر نہ لگے گی۔“

سینہ نے کہا۔

”تمہارے پاس انسٹنس ہے کیا؟“

علی اکبر نے انسٹنس نکال کر سینہ کو دکھایا۔ سینہ نے انسٹنس کو غور سے دیکھا۔ اس میں علی اکبر کی جو تصویر لگی تھی اس میں اس نے ٹائی لگا رکھی تھی اور سوٹ پہن رکھا تھا۔ سینہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

”کیوں میاں یہ تمہاری تصویر ہے؟“

”جی ہاں! جوانی کے دنوں کی یادگار ہے۔“

سینہ نے گردن جھکا کر کہا۔

”بہت خوب! دیکھو کل سے تم یہاں آ کر کام شروع کر دو۔ اگر تمہارا کام تسلی بخش ہوا تو مستقل طور پر تمہیں ملازم رکھ لیا جائے گا۔ تمہیں سو روپے تنخواہ ملے گی اور روپی وردی بھی نہیں ملے گی۔ تم اگر چاہو تو گیراج کے ساتھ والے کوارٹر میں رہ لینا۔“

علی اکبر کو بھلا اور کیا چاہیے تھا۔ سینہ گاڑی لے کر باہر نکل گیا۔ چوکیدار نے مسکرا کر علی اکبر کو مبارکباد دی۔

”بھائی ہمارے سینہ صاحب بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ اب تم آگئے ہو۔ تمہیں خود بخود معلوم ہو جائیں گی۔“

دوسرے روز علی اکبر شیر والی بوسیدہ کوٹھڑی سے اپنا سامان اٹھا کر سینہ کی کوٹھی کے کوارٹر

میں آ گیا اور اس نے سینہ کی گاڑی چلانا شروع کر دی۔ سینہ دیکھنے میں بڑا رحم دل معلوم ہوتا تھا۔ لیکن حقیقت میں بڑا سنگدل اور ظالم تھا۔ نوکروں کو مارنے پینے سے بھی گریز نہ کرتا تھا۔ کسی نوکری مجال نہ تھی کہ اس کے سامنے چوں بھی کر جائے۔ یہی حال سینہ کی بیوی کا تھا۔ گھر گرہستن قسم کی پردہ دار شریف گھرانے کی عورت تھی۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ سینہ کے پلے پڑ گئی تھی۔ کم زبان اور کم سخن تھی۔ سینہ سے زیادہ معمر اور بد شکل تھی۔ سینہ کے سامنے سر جھکائے کھڑی رہتی۔ خدمت گزار نوکرائی کی طرح اس کے ہر حکم کی فوراً تعمیل کرتی۔

سینہ کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ اسیس تیس برس کا سن تھا۔ مگر عیاشیوں اور شراب نوشی کی بہتاد نے توندیل اور بد شکل کر دیا تھا۔ چھ برس پہلے خاندان میں ہی شادی ہو گئی تھی۔ صرف ایک بچی ہوئی جس کا نام روزی تھا۔ ماں باپ کی بد صورتی اس بچی میں آ کر جمع ہو گئی تھی۔ مگر دولت نے ہر عیب کو چھپا دیا تھا۔ سینہ کا باپ حال ہی میں لاکھوں کا کاروبار چھوڑ کر مر گیا تھا۔ سینہ اگر چہ عیاش تھا مگر اپنے کاروبار میں بڑا ہوشیار تھا۔ ہیرے جواہرات کا دھندا کرتا تھا۔ سہ بھی کھیلتا تھا۔ حال ہی میں صابن کا ایک کارخانہ بھی لگایا تھا۔ اس کارخانے کا صابن ملک بھر میں مقبول ہو رہا تھا۔ کوٹھی بہت بڑی تھی۔ ڈیڑھ درجن کمرے تھے۔ چاروں طرف وسیع و عریض لان تھا۔ پچھلی جانب کیلے اور پیچھے کے پیڑوں میں چھپا ہوا ایک نہانے کا تالاب بھی تھا۔ اس تالاب میں سینہ کے مہمان مرد اور عورتیں نہایا کرتیں اور سینہ باہر آرام کرسی پر بیٹھا ان کا نظارہ کیا کرتا۔

کوٹھی میں کوئی چھ سات نوکر خدمت پر مامور تھے۔ دو گاڑیاں تھیں۔ دو جینیں اور چھ ٹرک تھے جو صرف کارخانے کے کام پر ہی مامور تھے۔ علی اکبر نے یہاں آ کر بڑی محنت سے کام شروع کر دیا۔ وہ سینہ کو ہر روز صبح سناک الائچ، کارخانے اور شہر والے نفلک دفاتر میں لے جاتا۔ سینہ ہر جگہ گھنٹہ دو گھنٹہ گزارتا اور پھر آگے روانہ ہو جاتا۔ شروع شروع میں علی اکبر باہر سڑک پر گاڑی میں بیٹھا سینہ کا انتظار کیا کرتا اور سڑک پر آتے جانے ہر بچے کو غور سے دیکھتا۔ اس خیال



سے کہ شاید اس کی بیٹی نغمہ کہیں دکھائی دے جائے۔ مگر نغمہ کو تو جسے زمین کھا گئی تھی۔ آسمان نگل گیا تھا۔ کچھ عرصے بعد جب علی اکبر سینھ کے مزاج سے پوری طرح باخبر ہو گیا۔ تو وہ گاڑی لے کر کبھی کلفٹن اور کبھی شہر کے کے دوسرے حصوں میں اپنی بیٹی کی تلاش میں نکل جاتا مٹھے مہینوں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ چھ برس بیت گئے۔ علی اکبر مزید بوڑھا ہو گیا۔ بیٹی کی جدائی نے اسے وقت سے بہت پہلے سفید کر دیا۔ اسی طرح چار برس اور بیت گئے۔ پورے دس برس گزر گئے اور نغمہ کا کہیں بھی سراغ نہ مل سکا۔ علی اکبر اب ناامید ہو چکا تھا اور اس امید کے سہارے زندہ تھا کہ اگر خدا کو منظور ہوا تو کبھی نہ کبھی اس کی بیٹی اسے ضرور مل جائے گی۔

وہ سوچتا اب تو نغمہ جوان ہو گئی ہوگی۔ اس کی عمر پندرہ برس کی ہوگی۔ کیا وہ اسے پہچان سکے گا؟ کیوں نہیں وہ تو اسے اگر وہ بوڑھی بھی ہو جائے تو پہچان لے گا۔ لیکن کیا نغمہ اپنے بوڑھے باپ کو پہچان سکے گی؟ وہ تو اب بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ سر اور داڑھی کے بال سفید ہو گئے تھے۔ جسم ڈبلا ہو کر جھک گیا تھا۔ اس کا تو دس برس پہلے کا طلیہ بدل گیا تھا۔ مگر شاید نغمہ کو باپ کی محبت کی روشنی اسے باپ کی طرف کھینچ کر لے آئے۔ شاید وہ اپنے باپ کو بھری محفل میں پہچان لے۔

نغمہ واقعی اب جوان ہو گئی تھی۔ پندرہ سولہ برس کا سن تھا۔ خوبصورت اور نوجوانی کا زور تھا۔ اس کے چہرے پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ جسم انتہائی دل آویز اور دلکش تھا۔ جب وہ ساڑھی پہن کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو کسی ریاست کی راج کمار کی معلوم ہوتی۔ باپ کی یاد اس کے دل سے محو تو نہیں ہوئی تھی مگر ماند ضرور پڑ گئی تھی۔ اس کی ماں مہمو نے اسے بڑے تازہ دم سے پروان چڑھا تھا۔ اس مالی کی طرح جو پھل دار درخت کی پوری طرح نگہداشت کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے پھل سے اس نے روزی کمانی ہوتی ہے۔

مہمو بائی کی مستقبل کی امیدوں کا چاند اس کی بیٹی نغمہ تھی وہ اس کے بڑھاپے کا سہارا بھی نغمہ ہی تھی۔ نغمہ کا حسن اور انہی جوانی کو دیکھ کر وہ پھولی نہیں ساتی تھی۔ اس نے اچھن خان کی

مدد سے نغمہ کو رقص اور موسیقی کی پوری پوری تعلیم دی تھی۔ نغمہ کا جسم بے حد پیارا تھا۔ قد انتہائی موزوں تھا۔ جب وہ ناچتی تو معلوم ہوتا کہ آسمان کی کوئی اپسار رقص کر رہی ہے۔ گھٹنوں کے چھناکوں میں اس کے گانے کی سریلی آواز مدغم ہو جاتی۔ نغمہ کی ماں نے بڑی عقل مندی سے کام لیتے ہوئے نغمہ کی تعلیم کے سلسلے کو جاری رکھا تھا۔ چنانچہ ان دنوں نغمہ ایک کالج کی گیارہویں جماعت کی طالبہ تھی۔ وہ اپنی لڑکی کو پڑھا لکھا کر اس کے زیادہ سے زیادہ دام وصول کرنا چاہتی تھی۔ مہمو نے شہر کی دوسری ریڈیوں سے قطع تعلق کر کے باہر سمندر کے کنارے ایک خوبصورت دو منزلہ بنگلہ کرائے پر لے لیا تھا۔ پرویز اس کے پاس ہی رہتا تھا۔ یہاں شام کو جب نغمہ کالج کے کام سے فارغ ہو جاتی تو بن سنور کر درمیانی کمرے میں قالین پر آ کر ٹکلیوں کے سہارے بیٹھ جاتی۔ اچھن خاں سادگی اٹھاتا طبلے پر تھاپ پڑتی اور نغمہ غزل کے بول شروع کر دیتی۔ ایک شعر گانے کے بعد وہ اٹھ کر محفل میں رقص کرنے لگتی۔ تماش بین واہ واہ کا شور مچا کر نونوں کی بارش برسانے لگتے مہمو بائی جلدی جلدی ان نونوں کو سیٹ کر چاندی کی ایک صندوقچی میں بند کرتی جاتی۔

اگرچہ نغمہ کو اس کی ماں نے گانے بجانے اور تماش بینوں کے دلوں کو بھرانے کی تعلیم دی تھی۔ لیکن نغمہ کا دل اس کام میں بالکل نہ لگتا تھا۔ وہ صرف اپنی ماں کی خوشنودی کی خاطر ایسا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ اس پر اپنی ماں کا رعب بھی بہت تھا۔ ماں نے نغمہ کو بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا۔ لیکن اس نغمہ پر اپنا اثر بھی پوری طرح ڈال رکھا تھا۔ نغمہ ماں کے دبے سے بہت ڈرتی تھی۔ مہمو بائی اب ایک بھر پور عورت بن چکی تھی۔ حکومت کرنے والی رعب دار عورت!

مہمو نے ناچ گانے کا کام خفیہ طور پر بااثر لوگوں سے مل کر شروع کر رکھا تھا۔ وگرنہ وہ ایک خاص ملاقات سے باہر اس کام کے اجرا کی مجاز نہ تھی۔ اس کی کوشی پر بڑے بڑے امیر اور بااثر لوگ اس کی بیٹی نغمہ کا گانا سننے آتے تھے۔ مہمو ان سے سینکڑوں روپے بنورق اور نغمہ کو ہاتھ نہ



لگانے دیتی۔ مجھ سے زیادہ جہاں دیدہ اور تجربہ کار طوائف شاید اس سارے علاقے میں نہ تھیں۔  
نفہ کے چاہنے والوں میں کارخانوں کے بد شکل بھدے مالک تھے۔ سکلر تھے امیر زمیندار تھے۔  
ہر کوئی اس سے محبت جتاتا تھا۔ نفہ کسی کو نہ لگاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس سلسلے میں اپنی ماں کی  
ہدایات کو بھی پس پشت ڈال دیتی تھی۔ اسے اس پیشے سے نفرت تھی۔ کالج میں جب وہ دوسری  
شریف لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ کر پروفیسر کے لیکچر سنتی تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ گناہ کا داغ ہے جو کالج  
میں بیماری کے جراثیم پھیلا رہا ہے۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہو جاتی۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ گھر  
بار چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں چلی جائے اور وہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے انسانی سوسائٹی میں  
نیکی اور تعمیر کا کوئی کام کرے۔ کالج میں اس کی کسی سبیلی کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ ایک طوائف کی بیٹی  
ہے اور یہاں سے واپس جا کر وہ طلبہ کی تھاپ پر ناچتی ہے اور محفل بادہ و جام برپا کرنے میں  
معاون ثابت ہوتی ہے۔

کالج میں صرف غزالہ ایک ایسی لڑکی تھی جس کو اس راز کا علم تھا۔ غزالہ نفہ کی بڑی گہری  
اور رازدار سبیلی تھی۔ دونوں میں بے حد پیار تھا۔ کالج کی لڑکیوں میں ان کی دوستی بڑی مشہور تھی۔  
دونوں ہر وقت ایک دوسری کے ساتھ دیکھی جاتی تھیں۔

لیکن نفہ کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ غزالہ اس شخص کی بیٹی ہے جو کبھی اس کی ماں مجھو بائی کا  
خاندانہ چکا تھا۔ یعنی احمد وکیل جو اب کراچی میں مجسٹریٹ لگا ہوا تھا۔ احمد وکیل نے نفہ کی ماں شمیم  
کو طلاق دینے کے بعد اپنی بڑی بہن کی وساطت سے مرزا صاحب کی بیٹی سے شادی کر لی اور  
کراچی میں آ کر وکالت شروع کر دی تھی۔ آدمی چونکہ بڑا ذہین اور قابل تھا۔ اس لئے دیکھتے  
دیکھتے ترقی کے منازل طے کرنے لگا۔ کچھ عرصہ وہ سرکاری وکیل رہا۔ پھر دو ایک امتحانات پاس  
کرنے کے بعد سول جج ہو گیا اور یہاں سے ترقی کر کے مجسٹریٹ کے عہدے تک جا پہنچا۔ کراچی  
میں اس کی اپنی ایک کوشی تھی۔ کار تھی۔ غزالہ اس کی بیٹی کالج میں پڑھتی تھی اور لڑکا جاوید بھی کالج

میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس کی صرف یہ دو بی اولادیں تھیں۔

نفہ کو بھی معلوم نہ تھا کہ غزالہ اس کی ماں کے پہلے خاوند کی بیٹی ہے۔ وہ دو ایک بار غزالہ  
کے گھر بھی گئی۔ احمد صاحب سے سامنا بھی ہوا مگر نہ تو مجسٹریٹ احمد نے اسے پہچانا اور نہ نفہ ہی  
پہچان سکی۔ وہ تو ان دنوں جب احمد کی ماں کو طلاق دی تھی بہت چھوٹی تھی۔ احمد بھی اب کافی بدل  
چکا تھا۔ بوزھا ہو گیا تھا۔ محنت اور کام کی زیادتی نے اس کے بال بھی سفید کر دیئے تھے اور چہرے  
پر لکیریں ڈال دی تھیں۔

جب پہلی بار نفہ اپنی سبیلی غزالہ کی کوشی پر گئی تو جاوید یعنی غزالہ کے بڑے بھائی کو دیکھ  
کر شرماسی گئی۔ جاوید بڑی دلکش شخصیت کا نوجوان خوبصورت اور لمبے قد کا خوش پوش لڑکا تھا۔  
کمیش کے گانوں کی وہ بڑی مہارت سے نقل کیا کرتا۔ اس کی آواز اچھی تھی اور وہ اچھا گایا کرتا تھا۔  
راک اینڈ رول بھی اس نے سیکھ لیا تھا۔ شام کو دوستوں کے ساتھ باپ کی کار میں سوار ہو کر سینما  
گھروں، تفریح گاہوں، باروں اور ہوٹلوں کے چکر بھی لگایا کرتا تھا۔ ویسے بڑا شرمیلا اور نیک  
نفس لڑکا تھا۔

اس نے بھی جب اپنے سامنے خوبصورت، سرو قد، نوجوان اور شباب کی تمام رعنائیوں  
سے بھرپور نفہ کو دیکھا تو وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ یہاں ہم قارئین کرام کی سہولت کے لئے اتنا  
عرض کر دیں کہ نفہ کی ماں نے کالج میں اس کا نام نجمہ لکھوایا تھا۔ کالج میں ہر کوئی اسے نجمہ کے نام  
سے پکارتا تھا یہاں تک کہ غزالہ کو بھی اس کے اصلی نام کی خبر نہ تھی۔ لہذا ہم اس لڑکی کی داستان  
بیان کرتے ہوئے اسے نفہ کے نام ہی سے پکاریں گے۔ ناول کے کردار اسے موقع محل کے مطابق  
کبھی نفہ اور کبھی نجمہ کے نام سے یاد کریں گے۔ غزالہ نے نفہ کا تعارف کروایا۔

”جاوید! یہ میری سبیلی نجمہ ہے ان سے ملو۔“

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

”شکریہ۔“

نغمہ نے آنکھیں نیچی کر لیں اور جاوید اسے ایک ہل کے لئے دیکھتا رہا۔ پھر قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ غزالہ نے کہا۔

”بھائی جان آپ مہمان تو نہیں ہیں۔ ذرا چائے بنا دیجئے ناں۔“

”ضرور ضرور! یہ تو بڑی خوشی کا فریضہ ہوگا۔“

جاوید چائے بنانے لگا۔ نغمہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

”چینی کتنی ڈالوں جناب؟“

نغمہ نے شرماتے ہوئے ذرا سا مسکرا کر کہا۔

”دو چمچ۔“

”ارے! آپ تو بڑی چینی جیتی ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں اس ماڈرن زمانے

میں کوئی بھی مہذب آدمی ایک سپون سے زیادہ چینی طلب نہیں کرتا۔“

غزالہ نے ہنس کر کہا۔

”انہیں ڈاکٹروں نے منع کر رکھا ہوگا۔“

جاوید نے جھک کر نغمہ سے کہا۔

”ویسے آپ تو اگر چائے میں انگلی ہی ڈبو دیں تو ساری چائے میٹھی

ہو جائے۔“

نغمہ شرمائی۔ اس نے مزہ دوسری طرف کر لیا اور غزالہ سے باتیں کرنے لگی۔ غزالہ نے

ایک والی پیٹ نغمہ کے آگے کر دی۔

”بھئی نجمہ! یہ ایک میں نے خود بنایا تھا۔ ذرا چکھ کر دیکھو کیا ہے؟“

جاوید نے فوراً کہا۔

”ظاہر ہے کڑوا ہوگا۔ تمہیں بھلا ایک بنانے کی کیا خبر تم تو رسوئی میں بیٹھ

کر بیٹھیں پکایا کرو۔“

غزالہ نے چمک کر کہا۔

”بھائی جان کبھی آپ نے میرے بنائے ہوئے ایک میں کوئی نقص دیکھا

ہے۔ پچھلے دنوں بھابی کی شادی کی سالگرہ پر میرے بنائے ہوئے کیکوں

کی ہر شخص تعریف کر رہا تھا۔“

جاوید نے چائے میں جھجھکتے ہوئے کہا۔

”ارے سہلی کی سالگرہ پر تو ایک بھی خوش ذوق مہمان نہ آیا تھا۔ کبھی

کر لیے گوشت کھانے والے جمع ہو گئے تھے۔ انہیں کیا خبر کیک کیا ہوتا

ہے۔“

غزالہ نے کہا۔ ”بہت اچھا ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے کیوں نجمہ کیسا ہے یہ کیک ذرا اچکھ

کر بناؤ۔“

”شرمائیے نہیں نجمہ صاحبہ! اصل بات کہہ دیجئے اور اپنی سہلی کی رعایت نہ

کیجئے میں دعوے سے کہتا ہوں کہ کیک جلا ہوا ہے۔“

نغمہ نے کہا۔

”جی نہیں بڑا مزے دار کیک ہے۔“

”اب بتائیے بھابی جان“ غزالہ نے خوشی سے تالی بجا کر کہا۔ جاوید ہنس پڑا اور نغمہ کی

طرف جھک کر کہنے لگا۔

”آپ نے اپنی سہلی کی بہت رعایت کی ہے۔ کاش آپ میرا بھی

خیال رکھتیں۔“



نغمہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ یہ وہ لڑکی تھی جو شام کو چھ سات تماش بینوں کے درمیان بیٹھ کر گاتی تھی۔ نرت کرتی تھی۔ رقص کرتی تھی۔ لیکن یہاں جاوید کی ذرا سی بات پر اس کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا تھا۔ کانوں سے سینک انھنے لگا تھا اور ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا۔ جب وہ غزالہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر واپس آنے لگی تو جاوید ڈرائیو کر رہا تھا۔ راستے بھر وہ دلچسپ لطیفے سناتا رہا۔ نغمہ اور غزالہ خوب ہنسیں۔ نغمہ نے ان لوگوں کو اپنا گھر نہیں بتایا تھا۔ غزالہ نے اسرار کے باوجود وہ کبھی اسے اپنے بنگلے پر نہیں لے گئی تھی۔ اس لئے وہ راستے میں ہی ایک جگہ کوئی بہانہ بنا کر اتر گئی۔ اور وہاں سے بس میں سوار ہو کر اپنی کوٹھی پہنچی۔ اس رات جب وہ تماش بینوں کے سامنے رقص کر رہی تھی تو وہ توڑا بھول بھول جاتی تھی اور اس کے پاؤں اکھڑے اکھڑے پڑ رہے تھے۔ اس کی ماں اسے تعجب اور غصے سے دیکھ لیتی تھی۔ مہمو بائی کو کیا معلوم کہ اس کی بیٹی جاوید کو دل دے بیٹھی ہے۔

نغمہ کی ماں نے نغمہ کی ناک میں نھنی ڈال رکھی تھی۔

یہ نھنی جب نغمہ کالج جانے لگتی تو اتار دی جاتی اور جب وہ کالج سے واپس گھر آتی تو دوبارہ پہنا دی جاتی۔ محض اس خیال سے کہ کالج میں اس پر شک نہ کیا جائے اور لڑکیوں کے دلوں میں خواہ مخواہ کے شبہات پیدا نہ ہوں۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ نغمہ ابھی تک کنواری تھی۔ کسی تماش بین نے اس کے ساتھ شب بسر نہ کی تھی۔ امیر آدمیوں نے مہمو بھائی کو کافی رقص کی پیشکش کی مگر وہ نہ مانی تھی۔ اس نے یہ کہہ کر ہر پیش کش کو ٹال دیا تھا کہ اس کی بیٹی ابھی کم عمر ہے۔ دراصل تجربہ کار پرانی طوائف اپنی بیٹی کے زیادہ دام اٹھوانا چاہتی تھی۔ نغمہ ان باتوں سے بے نیاز تھی۔ وہ گناہ کے ماحول میں ضرور رہتی تھی مگر ایسے جیسے کنول کا پھول کچھڑ میں اکتا ہے۔ مگر کچھڑ سے ہمیشہ بچا رہتا ہے اور اپنا سفید پاکیزہ چہرہ اٹھائے کچھڑ کے اوپر ہوا میں لہراتا رہتا ہے۔ ایسی گھڑیاں بہت کم آتیں جب نغمہ کمرے میں تنہا ہوتی اور وہ کپڑے تبدیل کرتے ہوئے یا غسل خانے میں نہاتے ہوئے اپنے جسم کو \_\_\_\_\_ گداز، جوان اور بھرپور جسم کو غور سے دیکھتی اور اس کے بدن میں ایک سنسنی سی ڈور جاتی۔ پھر اسے صرف جاوید کا خیال آتا اور وہ شرمناکراہنا بدن اپنے آپ سے پُرا لیتی۔ پرویز کی نیت نغمہ پر شروع ہی سے خراب تھی۔ مگر نغمہ نے نہ تو اس کی کبھی حوصلہ افزائی کی

تھی اور نہ ہی اسے کبھی منہ لگایا تھا۔ لیکن پرویز اس سے ہمیشہ خشن مذاق کیا کرتا۔ ایک دو بار نغہ نے اپنی ماں کو شکایت بھی کی۔ ماں نے پرویز سے کچھ نہ کہا۔ کیوں کہ پرویز کی مدد کے بغیر وہ ایک قدم آگے نہ بڑھ سکتی تھی۔ ویسے وہ محتاط ہو گئی اور اس نے پرویز کو کبھی نغہ کو تنہائی کا موقع نہ دیا۔ پرویز جھموبائی سے باقاعدہ کمیشن وصول کرتا تھا۔ ایک روز پرویز نے جھموبائی کو بتایا کہ شہر کا ایک انتہائی امیر سینھ جو کہ ہیرے جواہرات کا کاروبار کرتا ہے۔ نغہ کی تعریف سن کر آج یہاں آ رہا ہے۔ جھموبائی پہلے ہی یہی چاہتی تھی کہ وہ اپنی بیٹی تماش بینوں کے جھوم سے بچا کر کسی ایک امیر سینھ کی داشتہ بنا دے اور یوں اس سے ہزاروں روپے ماہوار کمائے۔ جب اس نے پرویز کی زبانی سنا کہ ہیرے جواہرات کا بیوپاری اس کی بیٹی کا گانا سننے رات کو آ رہا ہے تو وہ بڑی خوش ہوئی۔ اس نے بھی اسی سینھ کا شہرہ سن رکھا تھا۔

”کیا تم اسے خود لینے جاؤ گے؟“

”نہیں وہ خود آئے گا۔ رات کو دس بجے آئے گا۔ تم ایسا کرنا کہ اس وقت تک تمام لوگوں کو چلتا کر دینا۔ میرا خیال ہے اگر سینھ نغہ کو داشتہ رکھنے اور اس کی تنہی اتارنے پر راضی ہو گیا تو پانچ ہزار روپیہ مہینہ اور بیس ہزار ایک مشہد کہیں نہیں گیا۔ سینھ ہر ماہ لاکھوں روپے کماتا ہے۔ دس لاکھ تو ہر ماہ صرف اکم ٹیکس ہی ادا کرتا ہے۔“

جھموبائی کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے دیکھا کہ کراچی میں اس کی ایک اپنی کوٹھی ہے۔ کار ہے۔ بینک میں ہزاروں روپے اس کے اپنے نام پر جمع ہیں۔ وہ مزے سے کوٹھی کے ڈرننگ روم میں دیوان پر نیم دراز ہے اور ریڈیو گرام پر موسیقی ہو رہی ہے۔ اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”کیا وہ رات کو ضرور آئے گا پرویز؟“

پرویز نے مسکرا کر کہا۔

”اور نہیں تو کیا تم ہمیں کیا سمجھتی ہو۔ ایسے سبز باغ دکھا کر آیا ہوں کہ وہ ابھی آنے پر تیار ہو گیا تھا۔ لیکن میں اسے اور زیادہ بے تاب کرنا چاہتا تھا کہ میں نے کہا لڑکی کا لُج جھٹی ہوئی ہے۔ کالج سن کروہ اور زیادہ بے تاب ہو گیا تھا۔“

جھموبائی اور پرویز خوشی سے مسکرانے لگے۔ اس رات جھموبائی نے نغہ کی بیماری کا بہانہ بنا کر دو چار تماش بین جو آئے انہیں کوٹھی کے برآمدے ہی واپس رخصت کر دیا۔ پھر نغہ کو بناؤ سنگار سے آراستہ کیا اور سینھ کا انتظار کرنے لگی۔

ادھر سینھ بھی نہادھو کر سفید شیروانی پہن کر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا اس کے سونے کے بٹن بند کر رہا تھا اور اپنے چمک زدہ چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ باہر علی اکبر گاڑی پر کپڑا پھیر رہا تھا۔ کیونکہ اسے رات کے پورے دس بجے گاڑی گیراج سے نکال کر کوٹھی کے پورچ میں لانے کا حکم مل چکا تھا۔ اندر سینھ نے شیروانی کے طلائی بٹن بند کر کے الماری میں سے بیگ و سکی کا ایک پیگ نکال کر پیا اور گنگنا تا ہوا باہر نکل آیا۔

بوڑھے ڈرائیور علی اکبر نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ سینھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے کپڑوں سے بیش قیمت عطریات کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ کبھی اس طرح بن سنور کر عطر لگا کر علی اکبر بھی رنڈیوں کا گانا سننے جایا کرتا تھا۔ سینھ کی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیوں کے گھینے چمک رہے تھے۔

”کلفٹن کی طرف چلو“

علی اکبر ”بہت اچھا سرکار“ کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گیا اور سٹارٹ کر دی۔ گاڑی کراچی کی طویل اور کشادہ شاہراہوں پر کلفٹن کی طرف اڑی جانے لگی۔ سینھ کو پرویز نے کوٹھی کا حد درجہ



اسے اس کی کھوٹی ہوئی بیٹی ضرور مل جاتی لیکن کون جانے وہاں اس کے ساتھ کیا گذرتی۔ اسے پاگل سمجھ کر وہاں دھکے مار کر باہر نکال دیا جاتا۔

”چمن چمن چمن چمن چمن“

کونھی کے بند کمرے میں سے گھنگھروں کے چھٹکروں کی دھیمی دھیمی آواز باہر آنے لگی۔ علی اکبر سمجھ گیا کہ اس کا سینہ کسی طوائف کا گانا سننے آیا ہے اسے کیا خبر تھی کہ اندر اس کی بیٹی راج رہی ہے اور ماں کے اشاروں پر بھدے سینہ کا جی بہلا رہی ہے۔ علی اکبر نے جانے کیوں کچھ بے چینی محسوس کی۔ وہ گاڑی میں سے باہر آیا۔ سمندر کی طرف سے کیلی اور غم دار ہوا چل رہی تھی۔ علی اکبر تاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں کونھی کے دروازے کے پاس پتھروں کے ایک ڈھیر پر چپکے سے بیٹھ گیا اور اپنے غمگین خیالات میں کھو گیا۔ اسے ایک مدت بعد اپنی بیٹی کی یاد بڑی شدت سے ستانے لگی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آج ہی اس کی بیٹی گم ہو گئی ہو۔

کونھی کے اندر جمہو ہائی کے اشاروں پر نغہ بادل خواستہ رقص کر رہی تھی۔ اور غزل کا رقص بھی۔

بھنویں تھتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے بن کے بیٹھے ہیں  
کسی سے آج بگڑی ہے جو یوں بن خن کے بیٹھے ہیں  
الہی کیوں نہیں اٹھتی قیامت ماجرا کیا ہے  
کہ وہ آنسو بہائے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں

علی اکبر باہر بیٹھا تھا۔ بیٹی کونھی کے اندر راج رہی تھی۔ باپ باہر پتھروں پر پتھر بنا بیٹھا تھا۔ واقعی الہی کیوں نہیں اٹھتی قیامت ماجرا کیا ہے؟ یہ قیامت کی گھڑی نہیں تھی کیا؟ لیکن قدرت کے نظام کو سمجھنے کے لئے علی اکبر کے درد و غم کی نہیں بلکہ گہرے فکر و نظر کی ضرورت ہے۔

باپ — غمزہ باپ باہر بیٹھا رہا اور اندر دل گرفتہ نوجوان لڑکی عیاش طبع سینہ کے سامنے رقص

بالکل اچھی طرح ذہن نشین کروا دیا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹہ گاڑی کراچی کی مختلف سڑکوں پر بھاگتی رہی پھر دور سے سمندر کی ہلکی ہلکی ہوا سنائی دینے لگی۔ یہاں ایک موڑ گھوم کر گاڑی ایک نسبتاً پرسکون سڑک پر آ گئی۔ اس سڑک کی ایک جانب ریت کے نیلے تھے اور دوسری جانب ایک بہت بڑی زیر تعمیر عمارت عقب میں کیلے اور پام کے درختوں میں گھری ہوئی ایک اکیلی دو منزلہ پرانے طرز کی بھدی سی کونھی رات کے تاروں بھرے آسمان کے نیچے کھڑی تھی۔ یہی کونھی جمہو ہائی کی تھی۔

”گاڑی کونھی کے اندر لے جاؤ اور ہارن دیتا۔“

علی اکبر گاڑی کونھی کے اندر لے گیا۔ پورچ میں جا کر اس نے گاڑی روک دی اور ہارن دیا۔ ایک پل میں کونھی کے بڑے کمرے کا دروازہ کھلا اور پرویز مسکراتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس نے جھک کر سینہ صاحب کو آداب عرض کیا اور دروازہ کھول دیا

”تشریف لائیے سینہ صاحب“

سینہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے گاڑی سے باہر آ کر علی اکبر سے کہا۔

”گاڑی آؤ ہر دیوار کے پاس کھڑی کر دو۔“

علی اکبر نے پورچ میں سے گاڑی نکال کر پرلی طرف دیوار کے پاس لے گیا وہاں جا کر اس نے انجن بند کر دیا اور اگلی سیٹ پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ بائیں جانب سے تیز ہوا چل رہی تھی اور سمندر کی لہروں کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔ بے خبر بوڑھے کو کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کس جگہ آیا ہے اور کس کی خاطر سینہ کو لے کر آیا ہے۔ اگر وہ اس وقت گاڑی سے باہر نکل کر کونھی کے وسطی کمرے میں کسی طرح داخل ہو جاتا تو دیکھتا کہ سرخ قالین پر سفید دو حیا چاندنی پکھی ہے سینہ کا دیکھنے کے سہارے بیٹھا ہے پرویز اور جمہو ہائی یعنی علی اکبر کی پہلی بیوی شیم اس کے لئے پان بٹاری ہے اور اس کی بیٹی نغہ درمیان میں زرق برق لباس پہنے بیٹھی فٹنوں میں گھنگھروں کا بانہہ رہی ہے۔

خدا جانے یہ منظر دیکھ کر بڑھے باپ کے دل پر کیا گذرتی ہے۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ



مجمو بائی بولی۔

”سینہ صاحب میری لڑکی میرے جیسی ہے۔ آج تک کیا بجال جو کسی نے اسے ہاتھ بھی لگایا ہو۔ اگر آپ سے ہمارا معاملہ طے ہو گیا تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ سچ بول رہی تھی۔ باقی لوگ آپ کو مجبور نہیں کرتے۔ ہمارے گھر کے دروازے آپ پر کھلے ہیں۔ آپ جب چاہیں تشریف لاسکتے ہیں ویسے کاروبار کی بات جب بھی ہوگی ہم وہی دام لیں گے جو پرویز نے آپ کو بتائے ہیں۔“

سینہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا اور ایک ہاتھ میں شراب کا جام تھا۔ دوسرے ہاتھ وہ اپنی شیروانی کے سونے کے بٹن گھما رہا تھا۔

”پائی جی! آپ بیس ہزار تو شخص کے مانگتی ہیں اور پانچ ہزار روپیہ مہینہ کا جیب خرچ۔ خیر پانچ ہزار مہینہ پر تو میں راضی ہوں لیکن بیس ہزار والی بات میں نہیں مانوں گا۔“

پرویز نے اپنے گلاس کی شراب حلق میں اتارتے ہوئے کہا۔

”چلے آپ کیا دینا چاہتے ہیں؟“

سینہ نے شراب کی ایک ہلکی سی چسکی لے کر کہا۔

”میں تو زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار دے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ میں

ایک پائی بھی خرچ نہیں کر سکتا۔“

مجمو بائی نے کہا۔

”بہت اچھا سینہ صاحب ہم سوچ کر آپ کو جواب دیں گے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔“

کرتی رہی اور داغ کی غزل گاتی رہی۔ سینہ نے جیب سے سوسو کے نوٹ نکال کے سامنے رکھ لئے۔ شراب کا دور بھی ساتھ ہی ساتھ چلتا گیا۔ سینہ کو نغہ بے حد پسند آگئی تھی۔ وہ اس پر فدا ہوا جارہا تھا۔ نغہ ایسی نوعمر نوخیز اور شباب کی رعنائیوں سے بھرپور کنواری طوائف زادی اس نے بہت کم دیکھی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ بات اسے پسند آئی کہ نغہ کی نگاہوں میں طوائفوں جیسی بے باکی نہیں تھی۔ بلکہ ایک خاص قسم کی شرم اور حیا تھی۔ جھک اور ماحول سے بے نیازی کا ہلکا سا احساس تھا جب ایک بار نغہ سو روپے کا نوٹ پکڑنے رقص کرتی سینہ کے پاس آئی تو اس نے انگلی سے نغہ کی نتھنی کو چھو دیا۔ نغہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ سینہ کے بدن میں کچکی سی طاری ہو گئی۔

سینہ نے کوئی دو گھنٹوں میں وہاں دو ہزار روپیہ خرچ کر دیا۔ بعد میں جب نغہ تھک گئی اور اس کی ماں نے اسے اندر بھیج دیا تو سینہ سے بزنس کی بات شروع ہو گئی۔ پرویز اور مجمو بائی بڑی مکاری سے باتیں کرنے لگے۔

”سینہ صاحب ہم شریف لوگ ہیں۔ یہ کام تو مجبوری کی وجہ سے کر رہے

ہیں۔ اس لڑکی کا سنگیت رنوج میں کیپٹن تھا۔ ہوائی حادثے میں ہلاک ہو

گیا۔ اس کا تودل بچھ گیا ہے۔ کہیں شادی ہی نہیں کرتی۔ اب تو میں بھی

اس کی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ ناچ گانا سکھا دیا کہ شاید اس کا اسی طرح جی

بہل جائے۔“

پرویز نے سینہ کے کان میں کچھ کہا۔ سینہ نے مسکرا کر سر ہلایا۔

”یہ دام زیادہ ہیں مجمو بائی میں اتنے پیسے خرچ نہیں کر سکتا۔“

پرویز نے کہا۔

”جی آپ تو شہنشاہ لوگ ہیں شہنشاہ روپوں کے بارے میں اس طرح

سوچنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ یہ کام تو ہم مزدور لوگوں کا ہے۔“



آگیا۔ علی اکبر نے گاڑی گیراج میں کھڑی کر دی اور اپنے کوارٹر میں آکر کپڑے اتار کر دھوتی پہنی اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ آج اس کا ذہن اپنی بیٹی کی یاد میں بے چین ہو رہا تھا۔ اس کی حالت پہلے روز والی تھی جب نکلے پر سے نقد غائب ہو گئی تھی۔ اسے پندرہ برس پہلے تمام واقعات ایک ایک کڑ کے یاد آ رہے تھے۔ علی اکبر نے جیب میں نقد کی چھوٹی سی پھٹی ہوئی تصویر نکال کر دیکھی اور رونے لگا۔ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگا۔ اس تصویر میں پانچ سال کی پیاری سی نقد کرسی پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ جانے کس وقت علی اکبر کو نیند آئی۔

اُدھر سینہ صاحب شب خوابی کا لباس پہن کر اپنی الف لیلوی خواب گاہ میں داخل ہوئے تو ان کی بیگم صاحبہ نے انہیں بتایا کہ روزی کی طبیعت خراب ہے۔

”کیا بات ہوئی ہے؟“

”کہتی ہے سر درد کر رہا ہے۔“

”اسپرودینی تھی“

”میں دو گولیاں کھلا چکی ہوں۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“

”صبح دیکھا جائے گا۔“

سینہ کی بیٹی روزی اپنے کمرے میں سر کے درد میں مبتلا تھی۔ مگر شراب کے نشے میں چور سینہ بستر پر گرتے ہی خرانے لینے لگا۔ بیوی نے اٹھ کر اس کے جوتے اتارے۔ پاؤں چنگ پر کئے۔ چادر ڈالی اور اپنی بچی کے کمرے میں جا کر اس کی تیمارداری کرنے لگی۔ اسے اپنی حالت پر رحم آنے لگا۔ اسے اس گھر میں دولت کی کمی نہ تھی۔ اگر کی تھی تو سکون اور دل کے اطمینان کی۔ اسے خاوند کی محبت میسر نہ تھی۔ اس کی بچی باپ کے پیار سے محروم تھی۔ دولت کو لے کر اسے کیا کرنا تھا۔ سینہ خرانے لے رہا تھا۔ جنگلی بھینسے کی طرح۔ اور اس کی بیوی بیمار بچی کے سر ہانے بیٹھی چپکے چپکے رو رہی تھی۔

”بس اتنی جلدی تیار ہو گئے سینہ صاحب؟“

پرویز جو کہ سینہ کی باتوں سے سب سے زیادہ تنگ آگیا تھا۔ خوشامد انداز میں بولا۔  
سینہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”نیند آنے لگی ہے میاں۔“

سینہ نے تھوڑی ہی شراب پی تھی مگر اس کے قدم ڈمگمانے لگے تھے۔ پرویز اسے چھوڑنے کو بھی کہے تک آیا۔ علی اکبر نے جب دور سے سینہ کو باہر نکلتے دیکھا تو جلد سے کار لے کر پورچ میں آگیا۔ سینہ نشے میں تھا۔ اس کے پاؤں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ علی اکبر نے اسے خود ہاتھ تھام کر گاڑی میں سوار کیا اور گاڑی سٹارٹ کر کے کوٹھی سے باہر آگیا۔

”علی اکبر! ذرا اُدھر چلو۔ اُدھر۔ کیا کہتے ہیں وہ صدر۔۔۔ پان

کھائیں گے پان!“

”بہت اچھا سرکار“

اور علی اکبر نے صدر کی طرف گاڑی کا رخ کر دیا۔ سینہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا گنگنا رہا تھا پھر کہنے لگا۔

”علی اکبر! تم نے کبھی رنڈی کا گانا سنا ہے؟“

علی اکبر اسے کیا بتاتا کہ اس کی زندگی کی بربادی کا باعث ہی ایک رنڈی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”جوانی میں سرکار دو ایک بار دوستوں کے ساتھ کوٹھے پر جانے کا اتفاق ہوا ہے۔“

”ارے ظالم! کیسی لڑکی ہے یہ بس پٹاخہ ہے پٹاخہ ظالموں نے جی بھر کے

دیکھنے بھی نہیں دیا۔ سونے کی تختی پہن رکھی تھی ظالم نے!“

صدر میں آکر سینہ نے بان کھایا۔ دو چار بندھوا کر ساتھ رکھ لئے اور واپس کوٹھی میں

تھیں۔ جاوید گاڑی اکیلا دھاتا نغمہ کے کالج کے باہر ایک خفیہ جگہ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھیک وقت پر نغمہ چھٹی لے کر کتابیں اٹھائے باہر نکلی اور جاوید کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر کلفٹن کی طرف روانہ ہو گئی۔

”آج موسم کس قدر خوشگوار ہے نہ؟“

”ہاں۔۔۔ بڑا پیارا موسم ہے۔“

”میرا خیال ہے آج کلفٹن پر بڑی بھیڑ ہوگی۔ ہاں بے چلتے ہیں۔“

”ہائے اللہ وہ تو بہت دور ہے دیر ہو جائے گی۔“

جاوید نے سنیرنگ گھماتے ہوئے کہا۔

”ہمارے پاس گاڑی موجود ہے۔ دیر کیوں ہوگی۔ ایک آدھ گھنٹہ وہاں

گزار کر واپس آ جائیں گے۔ تمہارے کالج میں تو ابھی دو گھنٹے رہتے ہیں

تم دو گھنٹے بعد بھی گھر جا سکتی ہو۔“

”یہ تو ٹھیک ہے لیکن کہیں اس سے زیادہ دیر نہ ہو جائے۔“

”فکر نہ کرو اس سے زیادہ دیر نہیں ہوگی۔ ہاں بے کاسنڈر رکھا اور وسیع

ہے وہاں ہم زیادہ آسانی اور محبت سے باتیں کر سکیں گے۔“

نغمہ خاموش ہو گئی۔ اس نے جاوید کی آخری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ جاوید بھی

سگریٹ من میں دباے گاڑی چلاتا رہا اور خاموش رہا۔ گاڑی ہاں بے کے علاقے میں پہنچ گئی۔

دور سے سمندر کی نیلی لہریں اور بیچ کا سفید ریتلا کنارہ اور تک پھیلا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ بیچ پر کافی

دور تک گاڑی چلانے کے بعد جاوید نے ایک ہٹ کے باہر گاڑی کھڑی کر دی اور ہٹ کی طرف

بڑھتے ہوئے بولا۔

”یہ۔۔۔ دوستی ہٹ ہے اس کی چابی میرے پاس رہتی ہے۔“

نغمہ دوسرے تیسرے غزال کے گھر چلی جایا کرتی۔

قریباً ہر بار وہاں جاوید سے ملاقات ہوتی تھی۔ نغمہ در پردہ جاوید ہی سے ملنے وہاں جایا

کرتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد نغمہ جاوید سے کھل گئی تکلف کا پردہ درمیان سے اٹھ گیا۔ اب وہ

دونوں بڑی بے تکلفی اور دلچسپی سے ایک دوسرے سے باتیں کرنے اور کبھی کبھار ہلکا پھلکا مذاق بھی

کر لیا کرتے۔ جاوید بھی نغمہ سے بڑی محبت کرنے لگا تھا۔ وہ اس کی دھیمی دھیمی پیاری پیاری باتوں

اور دلکش چہرے کا دیوانہ وار عاشق ہو گیا تھا۔ نغمہ تو پہلے ہی روز جاوید کو دل دے بیٹھی تھی۔ مگر وہ

اسے اظہار محبت کرتے ہوئے گھبراتی تھی۔ ایک تو اس کی فطری شرم و امن گیر تھی۔ دوسرے وہ

چاہتی تھی کہ پہل جاوید کی طرف سے ہو۔ دوسرے وہ اس خیال سے بھی کبھی کبھی پریشان ہو جاتی

کہ اگر اس نے جاوید سے اپنی بے پایاں محبت کا اظہار کر دیا اور بعد میں جاوید کو علم ہو گیا کہ وہ تو

طوائف زادی ہے تو خوابوں کے محل زمین بوس ہو جائیں گے۔

جاوید نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نغمہ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دے گا۔ چنانچہ ایک روز

اس نے نغمہ کو سمندر پر چلنے کی دعوت دی جو نغمہ نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد تسلیم کر لی۔ اس روز

آسمان ابر آلود تھا اور صبح ہی سے بوند باندی ہو رہی تھی۔ کراچی شہر کی سڑکیں اور عمارتیں بھیگی ہوئی



نفرہ کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔

”ہٹ میں جا کر کیا کریں گے“

”نہیں تو نہ سہی“

دونوں سمندر کے ساتھ ساتھ بیچ پر چلنے لگے۔ ہوا میں نفرہ کا دوپٹہ پھڑپھڑا رہا تھا۔ اور سفید قمیض اور شلوار اس کے جسم کے ساتھ چپکی جا رہی تھی۔ سمندر کی لہریں دور سے دیوار بن کر انہیں اور ان کے قریب آتے آتے چھوٹی چھوٹی موجوں میں تقسیم ہو کر بیچ پر کچھ اوپر چڑھ کر پھر واپس چلی جاتیں۔

آسمان پر بادل بدستور چھائے ہوئے تھے اور اب بوند باندی رک گئی تھی۔ مغرب کی جانب سے کالی گھنای اٹھی ہوئی تھی جو آہستہ آہستہ کراچی کے آسمان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

جاوید نے نفرہ کا ہاتھ تھام لیا۔ نفرہ سست سی گئی۔

”نجمہ! میں تم سے ایک خاص بات کرنے یہاں آیا ہوں۔ جانتی ہو میں کیا

بات کرنے آیا ہوں؟ شاید تمہیں اس کا علم ہے مگر میں اپنی زبان سے وہ

بات کہوں گا۔ تاکہ تم کسی دہم یا شک میں نہ رہو۔ سنو!“

جاوید نے سگریٹ پھینک دیا۔ نفرہ کا ہاتھ تھوڑا سا اپنی طرف کھینچا اور اسکی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر بولا۔

”میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں نجمہ! اس محبت کا پھول میری زندگی کی

شہنی پر۔ اسی روز پھوٹ پڑا تھا جس روز میں نے پہلی بار تمہیں اپنے ہاں

دیکھا تھا۔ میں ہر روز جب تم نہیں ہوتی تھیں تو تمہیں یاد کیا کرتا تھا۔ میں

نہیں جانتا کہ میں تمہیں کس قدر پیار کرتا ہوں۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ ہر

روز رات کو تم خواب میں آتی ہو اور میرے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر سمندر

کی سیر کرتی ہو کیا تم بھی مجھے سے پیار کرتی ہو نجمہ؟ بولو نجمہ؟ کیا تم بھی

مجھ سے محبت کرتی ہو؟“

نفرہ نے سر جھکا لیا اور جاوید کے ساتھ ساتھ سمندر کے کنارے چلنے لگی۔ اس نے جاوید

کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایک تو وہ شرمیلی تھی۔ دوسرے وہ جاوید جیسے شریف گھرانے کے

لڑکے کے ساتھ اپنی محبت کی حامی نہیں بھرتا چاہتی تھی۔ کیا خبر جب اسے معلوم ہو کہ جس سے وہ

محبت کرتا ہے وہ طوائف زادی ہے تو اس کے دل پر کیا گزرتا ہے؟ مگر جب جاوید نے اپنی محبت کے

اظہار میں کمال کی حدوں کو چھو لیا اور بار بار نفرہ کا ہاتھ تھام کر اس نے محبت کی بھیگ مائی تو نفرہ سے

نہ ہا گیا۔ اس وقت وہ بیچ پر بہت دور نکل آئے تھے۔ اور نارمل کے دور چار درختوں کے اکیلے

جھنڈ کے درمیان کھڑے تھے۔ نفرہ نے جاوید کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر بے اختیار چوم لیا۔

جاوید نے اس کا چہرہ اور پرانٹھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

”یہ کیا نجمہ؟ تم رورہی ہو؟“

نفرہ کو جاوید کے منہ سے نجمہ کا نام اجنبی سا لگ رہا تھا۔ وہ چاہتی کہ وہ اسے اس کے صحیح

نام نفرہ سے پکارے مگر مجبور تھی۔ اسے اپنا اصلی نام نہیں بتا سکتی تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر بھیگی

چمکیں اٹھائیں اور مسکرا کر جاوید کو دیکھا۔

”مجھے معاف کرو جاوید“

”کیوں؟ کیوں نجمہ؟“

”میں رونے لگی تھی۔“

”تم کیوں رونے لگی تھیں؟“

یونہی اتنی ذہیر ساری محبت دیکھ کر جی بھرا آیا تھا۔

”بچی کہیں کی۔“

کے بغیر سوکھ جائے۔

جاوید نے نغمہ کو چومتے ہوئے کہا۔

”کیسی باتیں کرتی ہو نغمہ! بھلا ایسے کیونکر ہو سکتا ہے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور ساری زندگی محبت کرتا رہوں گا۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھلاؤں گا کبھی نہیں۔“

مغرب سے اٹھنے والی گھنا اب آسمان پر چھا چکی تھی۔ اچانک بادل زور سے گر جانغمہ نے ڈر کر کہا۔

”ہائے اللہ بارش آرہی ہے اب ہمیں واپس جانا چاہیے۔“

”چلو چلتے ہیں۔“

جاوید اور نغمہ واپس اس ہٹ کی طرف چل پڑے جہاں انہوں نے اپنی گاڑی کھڑی کی تھی۔ بارش نے ان دونوں کو راستے میں ہی لیا۔ بارش پہلے ہلکی ہلکی ہوتی رہی۔ جب وہ گاڑی کے پاس پہنچے تو بارش ایک دم تیز ہو گئی۔ جاوید نے لپک کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ نغمہ تیزی سے اندر جا بیٹھی۔ جاوید بھی اندر آ گیا۔ اس نے گاڑی کے شیشے چڑھادیے اور واپس روانہ ہو گیا۔ نغمہ جاوید کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ جاوید گاڑی بھی چلا رہا تھا اور ساتھ ساتھ نغمہ سے اظہار محبت بھی کر رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کا ہاتھ بھی سہلا لیتا تھا۔ نغمہ اسے منع کر رہی تھی۔

”خدا کے لئے کار دھیان سے چلاؤ جاوید بارش بہت زیادہ ہو رہی ہے۔“

”فکر نہ کرو تم۔“

بڑا موصلا دھار مینہ برس رہا تھا۔ سمندر کے کنارے ہا کس بے کی ریت میں گاڑی کے تار و جھنس رہے تھے۔ بڑی مشکل سے گاڑی پکی سڑک پر آگئی یہاں بھی راستے میں سڑکوں پر کہیں نہیں پانی کھڑا تھا۔ جاوید نغمہ کو کالج کے بس سناپ پر چھوڑ گیا۔

جاوید نے نغمہ کو اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کا منہ چوم لیا۔ نغمہ کانپ گئی۔ اس سے پہلے اسے اتنی محبت، اتنی اپنائیت اور اتنے پُر جوش انداز میں کسی نے نہ چوما تھا۔ اس نے اپنی ہانہیں جاوید کے گلے میں سما ل کر دیں اور اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا۔ جاوید نے نغمہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور دیر تک کبھی اس کے ہونٹ، کبھی رخسار کبھی آنکھیں اور کبھی گردن کو چومتا رہا۔

”نغمہ کا سانس پھول گیا۔“

”خدا خدا کے لئے جاوید۔“

”میری جان نغمہ! میری جان نغمہ! میں تم سے بے حد پیار کرتا ہوں محبت کرتا ہوں۔ میں ساری زندگی تم سے پیار کرتا رہوں گا۔ تمہارے نام کی مالا بچتا رہوں گا۔“

”مجھے بھول تو نہ جاؤ گے جاوید؟“

”میں اپنے آپ کو بھلا دوں گا مگر تمہیں نہیں نغمہ! تمہیں کبھی نہیں۔“

”خواہ کیسے بھی حالات ہوں تم مجھ سے اسی طرح محبت کرو گے جاوید؟“

”کیوں نہیں یہ محبت کوئی میرے اختیار میں تھوڑے ہے میں کوئی سوچ سمجھ کر تم سے محبت تو نہیں کر رہا۔ سوچ سمجھ کر تو کاروبار کیا جاتا ہے محبت نہیں۔“

نغمہ نے آہ بھر کر جاوید کا ہاتھ تھام لیا۔

”خدا کرے کہ تم اسی طرح مجھ سے محبت کرتے رہو۔ تمہارے ساتھ میری

زندگی کے باغ میں بہا آئی ہے۔ تمہارے ساتھ میری زندگی کے دیران

کھنڈروں میں چاند طلوع ہوا ہے اور صبح کی ٹھنڈی ہوا چلی ہے۔ اگر تم نے

مجھے بھلا دیا تو میں اس پھول کی طرح سر جھکاؤں گی جو دھوپ میں پانی



”بہر حال دیکھا جائے گا۔ تم جاؤ تو سہی۔“

پرویز جا کر سینھ سے ملا اور اسے بتایا کہ مہمو بائی نے ان کی پندرہ ہزار کی پیش کش منظور

کر لی ہے۔ سینھ نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

”بڑی اچھی بات ہے۔ آپ لڑکی کو کل یہاں لے آئیں۔ میں رقم ادا کر دوں گا۔“

پرویز نے ہچکچا کر کہا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ہمارے غریب خانے پر تشریف لے چلیں؟“

سینھ نے ہنسنے میں اوپر اٹھا کر کہا۔

”یہ بات میری وضع داری کے خلاف ہے۔ لڑکی میرے پاس یہاں آئے گی۔“

”جیسے آپ کی مرضی“ پرویز نے واپس آ کر مہمو بائی کو سارا ماجرا سنا دیا۔ اب سب

سے بڑا مسئلہ نفوذ کو تیار کرانے کا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اس کام کے لئے راضی نہ ہو۔ لیکن مہمو بائی کو

پورا پورا یقین تھا کہ اس کی بچی اپنی ماں کا کہا نہیں ٹالے گی۔

لیکن جب مہمو بائی نے رات کے کھانے کے بعد بڑے طریقوں سے نفوذ سے صرف

مطلب بیان کیا تو نفوذ نے سینھ کے گھر جانے یا اپنے گھر میں اس کے ساتھ رہنے سے صاف انکار

کر دیا۔ مہمو بائی اتنے واضح کاف لفظوں میں انکار سننے کے لئے بالکل تیار نہ تھی۔ اس نے غصے بھری

نظروں سے نفوذ کو دیکھا۔

”تمہیں اپنی ماں کے سامنے زبان درازی کرتے شرم آتی چاہیے۔“

نفوذ نے پھر کر کہا۔

”اگر ماں کو جینی کا سودا کرتے شرم نہیں آتی تو بیٹی اپنے حق اور عزت کی

حفاظت کے لئے شرم سے کیوں کام لے؟ تم نے مجھے ہر ایرے غیر کے

سامنے نچوایا۔ میں نے آف تک نہ کی۔ تم نے مجھے مجبور کیا کہ میں دولت

نفوذ نے اسے خود ہاں اترنے کو کہا تھا۔ وہ بس سناپ کے چھوٹے سے چھجے تلے بیٹھ کر

بس کا انتظار کرنے لگی۔ آج گاڑی خراب تھی اور اسے بس میں سوار ہو کر ہی واپس گھر جانا تھا۔ کوئی

پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد بس آ گئی۔ نفوذ بس میں سوار ہو گئی اور بس منزل مقصود کی طرف روانہ

ہو گئی۔ گھر پہنچ کر نفوذ نے چائے کے ساتھ کچھ بسکٹ کھائے اور اپنے کمرے میں جا کر پٹنگ پر

کتاب لے کر پڑ گئی۔ بظاہر وہ پڑھ رہی تھی۔ مگر حقیقت میں وہ جاوید کے پیار بھرے خوابوں میں

کھوئی ہوئی تھی۔ اسے جاوید کی ایک ایک شہد سے زیادہ مینھی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اس کا نفوذ کی

طرف محبت کی گہری نگاہوں سے دیکھنے کا انداز ساحل سمندر پر اسے سینے سے لگا کر ہونٹ چومنا

کار میں اس کا بار بار ہاتھ اپنے گرم ہاتھ میں لے کر سہلاتا۔ نفوذ کے لئے یہ ساری باتیں عشق و محبت

کی رومان پروردادی کے نئے نئے کھلے ہوئے شگوفے تھے۔ اس پر محبت کے نئے نئے دروازے

کھل رہے تھے۔

نفوذ اپنے کمرے میں پٹنگ پر لیٹی ان خوبصورت تصورات اور عشق انگیز تخیلات میں مگن

تھی اور ادھر دوسرے کمرے میں اس کی ماں مہمو بائی اور پرویز نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ سینھ کے

پندرہ ہزار روپے کی پیش کش منظور کر لی جائے۔

”مہمو اس سے زیادہ رقم اس شہر میں کوئی نہیں دے گا اور پھر تمہنی کا کیا

ہے۔ ہم دوبارہ نفوذ کو پنادیں گے کسی کو کیا خبر کہ یہ کتنی بار اتر چکی ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پندرہ ہزار سے بھی ہاتھ

دھونے پڑیں۔ روپے کی ہمیں اشد ضرورت ہے۔ تم ایسا کرو کہ آج ہی

سینھ سے جا کر مل لینا اور کل کی بات طے کر دینا۔ تمہنی یہاں اترے گی۔“

پرویز نے کہا۔

”شاید اس بات پر وہ راضی نہ ہو۔“

کروں گی تمہیں۔ گہنے میں لاؤ کروہن بنا کر گھر سے نیک بیٹیوں کی طرح  
رخصت کروں گی۔

اتنا کہہ کر جھمبہ بانی نے نغمہ کا ماتھا چوما اور چلی گئی۔ نغمہ مزید پریشان ہو گئی۔ وہ سوائے  
جاوید کے اور کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس کی ماں نے اس کے دل کی بات سنی ہی نہ  
تھی۔ کیا اس کی ماں جاوید سے شادی کر دینے پر راضی ہو جائے گی؟ کیوں نہیں؟ میری ماں کو مجھ  
سے بڑی محبت ہے۔ اگر وہ میری خاطر اتنی بڑی قربانی کر سکتی ہے۔ تو جاوید سے بیاہ کر دینے میں  
اسے کیا اعتراض ہوگا۔ جاوید اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا باپ شہر میں مجسٹریٹ لگا  
ہے۔ اس کی ماں کو کیا اعتراض ہوگا؟ لیکن نغمہ کے حلق میں جیسے جملہ انک کر رہ گیا۔ لیکن کیا  
جاوید کے ماں باپ ایک طوائف کی بیٹی سے اپنے بچے کی شادی کر دیں گے؟ کیا وہ یہ گوارا کر لیں  
گے کہ لوگ ان کی بہو کو طوائف زادی کہہ کر پکاریں؟ کیا راز افشا ہو جانے پر جاوید اس سے اپنی  
محبت برقرار رکھ سکے گا؟

نغمہ کو اپنی ماں پر سخت غصہ آیا۔ اس نے اس کی زندگی کا رخ تباہی کے دھارے کی  
طرف موڑ دیا۔ اگر اب بھی وہ گھر میں شریفانہ زندگی بسر کرنا شروع کر دے تو نغمہ کا مستقبل  
خوشیوں کی جنت بن سکتا ہے۔ نغمہ نے دل میں فیصلہ کر لیا وہ آج سے پھر کبھی گھٹکرہ نہیں باندھے  
گی۔ کبھی عیاش لوگوں کی محفل میں آکر ان کے جام نہیں بھرے گی اور کوہلے مکا مکا کر رقص نہیں  
کرے گی۔ وہ صبح ہی اپنی ماں سے کہہ دے گی کہ اب وہ بزم میں شمع محفل بن کر رقص نہیں کر  
سکتی۔ کیونکہ وہ طبعاً شریف ہے اور ایک باعزت خاندان میں شادی کر کے ایک شریف بیوی بن  
کر زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔

نغمہ کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔ اب اسے اپنی منزل کے تمام راستوں پر سے  
اندھیرے اور جند کی چادریں فضا میں تحلیل ہوتی دکھائی دیں۔ اب اس نے اپنے سائے جاوید کو

مند عیاش فتنوں اور لقللوں کے بام شراب سے بھروں اور میں نے تم  
سے ذرا گلہ نہ کیا۔ تم نے میرے پاؤں میں بے حیائی کے گھٹکرہ ڈال کر  
مجھے سر محفل نچوایا اور میں تاجپتی رہی، تاجپتی رہی۔ لیکن ہر شے کی  
ایک حد ہوتی ہے۔ میں تمہارے لئے یہ سب کچھ تو کر سکتی تھی اور اگر رہی  
ہوں لیکن اپنی عصمت کا بیو پار نہیں کر سکتی۔ اس کی حفاظت کے لئے اگر  
مجھے اپنی جان بھی دینی پڑے تو دریغ نہ کروں گی۔

جھمبہ بانی تو اپنی بیٹی کا مزہ ہی نکلتی رہ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ دباؤ سے اب کام نہیں چل  
سکتا۔ منہ زور جوانی دباؤ نہیں سہا کرتی۔ وہ اپنی مرضی سے سر پر پہاڑ گر سکتی ہے لیکن کسی کے  
دباؤ سے ایک تنکے کا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتی۔ وہ پریشان ہو گئی۔ اس کے سارے خواب منتشر ہو کر  
خس و خاشاک کی مانند آندھی کے جھکڑوں میں اڑنے لگے تھے۔ جس لڑکی سے اس نے اپنے  
بڑھاپے کی ساری امیدیں وابستہ کی تھیں۔ وہی اسے دھوکا دے کر اس کے ہاتھ سے نکلی جا رہی  
تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ نغمہ سے کیا کہے۔ اسے راہ راست سے بھٹکا کر برائی کے  
راستے کی طرف کیسے لائے۔ آخر اس نے بڑھ کر نغمہ کو گلے سے لگالیا۔ اس کے تجربہ کار دماغ نے  
اسے بڑا دل آویز راستہ دکھا دیا تھا۔

”تم نے میری آنکھوں پر سے پنی اتار دی ہے میری بیٹی۔ میں راست  
بھٹک گئی تھی۔ اب مجھے اندھیرے میں روشنی کی کرن نظر آ گئی ہے۔ میں  
ایسا غلط قدم پھر کبھی نہیں اٹھاؤں گی۔“

نغمہ اپنی ماں کے گلے لگ گئی اور رونے لگی۔ جھمبہ بانی نے بھی دو چار جھومے نسوے  
بہائے اور اسے پٹک پر لٹا کر بولی۔

”اب تم سو جاؤ۔ صبح کالج جانا ہے۔ میں انشاء اللہ تمہارا بڑی اچھی جگہ بیاہ



رہے گی۔ لڑکی سے یہ کہیں گے کہ اس کی سینھ سے شادی کر دی ہے اسے  
دلہن بنا کر باقاعدہ تیار کیا جائے گا۔

پرویز نے کہا۔

”یہ تو ظلم ہو گا جھمو۔ اکٹھاسات ہزار کا نقصان لیکن۔۔۔ فرض کر  
لیا اگر وہ شادی پر رضا مند نہ ہوئی تو کیا کرو گی؟“

جھمو نے سرونتہ پلیٹ میں پھینک کر کہا۔

”تو میں اس کا گلا دبا دوں گی۔ میں اسے جو تے لگاؤں گی آخر میں اس کی  
ماں ہوں کوئی کیلی نہیں ہوں۔ میں اس کا نڈا بھلا اس سے زیادہ سوچ سمجھ  
سکتی ہوں۔“

”خدا کرے کہ وہ تمہاری بات مان جائے۔ مجھے تو اب اس پر شک ہو گیا

ہے کہیں وہ کسی سے محبت تو نہیں کرنے لگی جھمو بانی؟“

جھمو نے طنزاً مسکراتے ہوئے کہا۔

”محبت نام کی چڑیا طوائف کے گلشن میں کبھی نہیں چھپ جاتی۔“

دوسرے روز صبح جب نغدہ کالج کی تیاریاں کر رہی تھی تو اس کی ماں نے اس سے کہا ”بیٹی

آج کالج سے چھٹی کر لو۔ کہیں جانا ہے“ مگر نغدہ نے اس روز جاوید سے ملنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اس

نے کہا۔

”آج پروڈیوسر صاحب نے بڑا ضروری لیکچر دینا ہے امی آج کالج جانا بڑا

ضروری ہے۔“

جھمو نے ذرا غصے سے کہا۔

”نہیں نہیں۔ آج کالج جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

بانٹیں پھیلائے کھڑے دیکھا۔ وہ مسکراتا ہوا اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ نغدہ کے چہرے پر  
مسکراہٹ آگئی۔ اس نے خوشی سے ایک بھر جھری سی لی اور سر ہانے کو اپنے ساتھ لگا کر سو گئی۔  
محبت کے بیٹھے پنوں میں کھو گئی۔

ادھر جھمو بانی نے پریشانی کے عالم میں پرویز کو جب ساری بات سنائی تو وہ بھی حیران  
رہ گیا۔ ان میں سے کسی کو بھی یہ وہم تک نہ تھا کہ نغدہ جو کل تک شرابیوں کے درمیان گھٹسٹھروا باندھ کر  
ناچتی رہی ہے عین موقع پر انہیں ناامید کر دے گی اور شرافت کی اوڑھنی اوڑھ کر کونے میں دبک  
جائے گی۔ پرویز نے سگریٹ سلاک کر کمرے میں جیتابی سے ٹھٹھٹے ہوئے کہا۔

”جھمو بانی پندرہ ہزار روپے کا معاملہ ہے اور تین ہزار ماہوار کی رقم الگ

ڈوب رہی ہے۔ سینھ کل شام میرا اور نغدہ کا انتظار کرے گا۔ میں اکیلا کیا

منہ لے کر اس کے پاس جاؤں گا۔ اس لڑکی نے تو ہمیں کہیں کا نہیں

رکھا۔ کیا اس نے کے لئے ہم نے اتنا بڑا خطرہ مول لے کر اسے اغوا کیا

تھا۔ جان جو کھوں میں ڈال کر اسے اٹھا کر لائے تھے۔ اسے پال پوس

کر پڑھا لکھا کر بڑا کیا تھا؟ اس لڑکی نے تو ہمارے کئے کرائے پر پانی

پھیر دیا ہے۔“

جھمو نے سر جھکا رکھا تھا اور بے خیالی کے عالم میں سرونتہ سے چھالیا کتر رہی تھی۔

”میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔“

”پھر اور کیا ہو گا؟“

جھمو نے آہ بھر کر کہا۔

”ہو گا کیا۔۔۔ پندرہ ہزار کی پہلی رقم سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ آٹھ

ہزار میں ایندھن مشینوں کی اور تین ہزار مینے بھر کا اور یہ سینھ کی داشتہ بن کر

نغمہ نے پوچھا۔

”آخر اتنا ضروری کام کون سا ہے؟“

مجھم نے نغمہ کی طرف آنکھیں اٹھا کر کہا۔

”میں آج تمہاری شادی کر رہی ہوں۔“

نغمہ پر جیسے ایک دم بجلی سی گر پڑی۔ اس کے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے۔ ذہن پتھر بن گیا۔

اسے اپنی ماں کے جملے پر یقین نہ آیا۔

”شادی؟ میری شادی ماں؟“

”ہاں ہاں اور کیا میری شادی ہوگی؟ میں تمہارے نوڑے لارہی ہوں۔ تم

نہا دھو کر تیار ہو جاؤ۔ شام کو برات آ رہی ہے۔“

نغمہ نے چیخ کر کہا۔

”میں شادی نہیں کروں گی۔ ہرگز نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں کروں گی میں

شادی کبھی نہیں کروں گی۔“

مجھم بائی کو غصہ آ گیا۔ اس کی زندگی کی ساری روشنیاں ایک ایک کر کے بجھ رہی

تھیں۔ اس نے زور سے نغمہ کے منہ پر تھپڑ مارا۔ نغمہ چلا کر پٹنگ پر گری اور اوندھام نہ کر کے ہچکیاں

لے لے کر رونے لگی۔ ”میں دیکھوں گی تم کیسے شادی نہیں کرتیں۔“ اتنا کہہ کر اس کی ماں باہر نکل

گئی اور دروازہ اس نے باہر سے بند کر کے کنڈی لگا دی۔

نغمہ کو زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ بے بس و مجبور ہو کر رہ گئی ہے۔ اس نے اپنے

آپ کو کمرے میں قید دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں۔ مگر

وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ سوائے رونے، سسکیاں بھرنے، جاوید کو یاد کر کے آہیں بھرنے اور آنسو

بہانے کے اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی مانند چمکا۔ اس نے

سوچا کہ وہ اپنی ماں سے سیدھے اور صاف انداز میں ٹکرائی تو اس کی شکست یقینی ہے۔ اسے عقل

اور ہوشیاری سے کام لینا چاہیے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھیں پونچھیں اور آہٹے

میں جا کر اپنا پیارا مگر رویا ہوا چہرہ دیکھنے لگی۔

مجھم نے دوسرے کمرے میں جاتے ہی پرویز سے کہا کہ وہ سینٹھ کے پاس جا کر اسے

بتا دے کہ ہم نغمہ کو ان سے غیر رسمی سی شادی کریں گے۔ صرف لڑکی کی تسلی کی خاطر۔ باقی نکاح نامہ

وغیر کچھ نہیں لکھا جائے گا۔ لیکن سات ہزار منہ سلامی کے اور تین ہزار ماہوار کی پہلی قسط پیشگی لی

جائے گی۔ اور لڑکی اُن کے گھر ہی رہے گی۔ پرویز بادل غواست اٹھ کر جانے ہی والا تھا کہ انہیں نغمہ

کے کمرے سے دشمنوں کی آوازیں سنائی دیں۔

”دروازہ کھول، مجھم! اسنے قیمتی مال سے جذباتی بن کر نہ کھیلو۔ تمہیں قتل



ماں اس خیال سے ہی خوش ہو گئی کہ اس کی بچی اس کے راستے پر تو آ گئی ہے۔ اب جلدی یا دیر سے شادی کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ طے ہو گیا تھا۔ اس نے نغہ کو گلے سے لگا کر چوما اور اپنے ہاتھ سے اس کے بالوں میں کنگھی کی اور اسے کالج کی گاڑی میں بٹھا کر رخصت کیا۔

پرویز کی جان میں جان آئی۔ دراصل ان دونوں کی جانیں اس ایک لڑکی میں تھیں۔ وہ بوڑھے ہو رہے تھے۔ لیکن انہیں اپنی جوانی نغہ کے جسم میں بند کر کے رکھ دی تھی اور نغہ کی زندگی کے ساتھ ساتھ جوان رہنا چاہتے تھے۔

کالج جا کر نغہ نے چھٹی لی اور سیدھی جاوید کے کالج پہنچ گئی۔ جاوید کلاس روم میں تھا۔ اس نے چپڑا اسی بھیج کر اسے باہر بلوایا اور دونوں صدر کے ایک ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہاں نغہ نے اسے بتایا کہ اس کے ماں باپ اس کی شادی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔

”کہاں؟ کس جگہ؟“

جاوید نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”یہ میں نہیں جانتی۔“

”ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تمہیں اپنے سے کبھی الگ نہیں ہونے دوں

گا۔ میرے سوا اور کوئی نہیں بیاہ کر لے جاسکتا۔ میں آج ہی ابا جان سے

بات کر کے شادی کا پیغام بھجواتا ہوں۔“

نغہ بھی پریشان ہو گئی بھلا وہ یہ کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ اس کا باپ ان کے گھر شادی کا پیغام لے کر آئے اور وہاں طلبے، سارنگیاں پاندان، گلہ دان اور گھٹنگھر و بکھرے جوئے دیکھے کیا وہ جاوید کو بتا دے کہ وہ رندی کی بیٹی ہے۔ مگر شریف بیوی بن کر زندگی بسر کرنا چاہتی ہے؟ نہیں نہیں! جاوید کو بڑا صدمہ ہو گا۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے گا۔ وہ ایک دم اسے چوڑ کر چل دے گا چک۔

سے کام لینا چاہیے۔“

چھمو نے منہ بنا کر کہا۔

”میں اس بد لگام کامنہ نہیں دیکھنا چاہتی۔“

”تم یہیں ٹھہرو میں جا کر کھولے دیتا ہوں۔“

چھمو نے جلدی سے کہا۔

”نہیں نہیں تم نہ جاؤ۔ تمہارے جانے سے معاملہ زیادہ خراب ہو جائے

گا۔ میں خود جاتی ہوں۔“

جب چھمو نے دروازہ کھولا تو سامنے نغہ کھڑی تھی۔ نغہ کے چہرے پر پریشانی کی

بجائے اطمینان اور سکون تھا۔ چھمو کو کچھ تسلی ہوئی۔ اس نے سوچا شاید اس کی بیٹی نے اپنا ارادہ

بدل لیا ہے۔ اور حقیقت بھی بظاہر یہی تھی۔

”ماں مجھے معاف کر دو۔ میں نے گستاخی سے کام لیا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔“

”میری بچی!“

چھمو نے بھاگ کر اپنی بیٹی کو اپنے خزانے کو اپنے انتہائی قیمتی مال کو سینے سے لگا لیا اور

اسے گلے سے لگائے اس طرح پیار کرنے کرنے لگی جس طرح کنجوس آدمی تنہائی میں روپوں سے

بھری ہوئی قسبی کو پیار کرتا ہے۔

”تم جہاں کہو گی میں شادی کر لوں گی ماں۔ میں تمہارا دل تو زکریا بگاڑ

نہیں بنوں گی۔ لیکن مجھے ابھی شادی پر مجبور نہ کرو۔ ابھی میرا دل نہیں

چاہتا۔ میں کالج کی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہوں۔ میں پڑھ لوں گی تو جہاں

چاہے میری شادی کر دینا۔“

”جیسے تمہاری مرضی بیٹی۔ جیسے تمہاری مرضی۔“

جھپکنے میں محبت کا ناطہ توڑ دے گا۔ ابھی وقت نہیں آیا۔ ابھی وقت نہیں آیا۔

لیکن اگر نغمہ اسی وقت جاوید کو ساری باتیں بتا دیتی تو شاید حالات اتنے زیادہ خراب نہ ہوتے۔ مگر تقدیر کے چکر میں جو گرد و شیں ہوتی ہیں وہ انسان کو ہر حالت میں برداشت کرنی ہی پڑتی ہیں۔ نغمہ اور جاوید ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہونے کے نئے سرے سے عہدہ بیان کر کے رخصت ہو گئے۔

نغمہ چونکہ اپنی ماں کی خوشنودی چاہتی تھی۔ تاکہ اپنی فرماں برداری اور اطاعت گزاری سے اس کا دل موم کرے اور اس سے اپنی بات منوالے اس لئے وہ اس کے ہر اشارے پر حسب سابق عمل کرنے لگی۔ اس نے رات کو پھر گھٹکھر باندھ لئے اور سر محفل رقص کرنے لگی۔ چھو بائی اور پرویز نے نغمہ کی بیماری کا بہانہ بنا کر سینٹھ سے اس کی شادی کو کچھ دنوں کے لئے ٹال دیا۔ اس دوران میں وہ سینٹھ کے بارے میں نغمہ کے دل سے تعصبات دور کرنے میں مصروف ہو گئی۔ سینٹھ اب ہر روز رات کو چھو بائی کی کوٹھی پر نغمہ کا گانا سننے اور ناچ دیکھنے آتا۔ چھو بائی کو اس کے پاس اکیلا چھوڑ کر جان بوجھ کر باہر چلی جاتی۔ سینٹھ کو نغمہ سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اس پر جان دینے لگا تھا۔ نغمہ بھی حسین اور جوان تھی۔ اور پھر وہ سینٹھ کے سامنے اور خود سر پرستی۔ اس انداز سے سینٹھ کی آتش عشق پر تیل کا کام کیا اور وہ اس کا اور زیادہ متوالا ہو گیا۔ وہ ہاتھ باندھ کر نغمہ کے آگے دوڑا تو بیٹھا رہتا اور اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا۔ نغمہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی ماں اسی سینٹھ سے اس کی شادی کر کے ہزاروں روپے کمانا چاہتی ہے۔ نغمہ کو سینٹھ کی چچک زدہ کالی کلونی صورت اور بھد سے تو ندیل جسم سے نفرت تھی۔ مگر وہ صرف اس لئے اس کی ولجوبی کیا کرتی کہ اس طرح وہ اپنی ماں کو خوش رکھ سکے گی اور جب اس کی ماں خوش ہوگی تو وہ اس سے اپنی بات منوالے گی۔

جاوید کا ایک دوست اکمل ٹیکس آفیسر تھا۔ اکمل ٹیکس والوں سے دولت مند اور دولت پیدا کرنے والے لوگ بڑا گھبراتے ہیں۔ ان پر ان کے کارخانوں اور دفاتروں کے دروازے ہمیشہ

کھلے رہتے ہیں۔ جاوید کا یہ دوست زندہ دل من موہنی قسم کا کنوارا آدمی تھا۔ شغل میں نوشی بھی کرتا اور کبھی کبھی رنڈیوں کا گانا سننے بھی چلا جاتا۔ جاوید کبھی اس کے ساتھ اس قسم کی محفلوں میں شریک نہیں ہوا تھا۔ ایک روز اس نے جاوید سے کہا۔

”یار! آج میرے ساتھ چلو۔ تمہیں ایک ایسی جگہ لئے چلتا ہوں کہ زندگی بھر اس نہ بھول سکو گے۔“

”وہاں کیا ہے؟“

”وہاں کیا نہیں ہے دوست؟ ایک ایسی لڑکی ہے دیکھ کر ہوش گم ہو جائیں گے۔ یونا ساقد، اتار کے بیڑ جیسا بھلا ہوا بدن، کپکپے ہوئے سیب ایسے سرخ گال، سفید اتار کے دانوں ایسے دات اور شہد سے میٹھی باتیں اور جب وہ رقص کرتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے ساری کائنات اس کے ساتھ رقص کر رہی ہے۔“

جاوید ایسی جگہوں پر کبھی نہ گیا تھا۔ لیکن اس کا دوست بے حد اصرار کرتا گیا اور آخر اس نے جاوید کو اپنی گاڑی میں ڈال کر گاڑی شارٹ کروی۔

اس وقت رات کے کوئی دس بجے ہوں گے۔ جاوید کے دوست نے شراب پی رکھی تھی۔ مگر بڑی ہوشمندی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ کراچی کے آسمان پر بے شمار ستارے چمک رہے تھے۔ اونچی عمارتوں کی روشنیاں دور دور سے جھلک رہی تھیں۔ گاڑی سمندر کے ساتھ والی سڑک پر کافی دور تک چلی گئی۔ پھر اچانک بائیں جانب مڑی اور ایک زیر تعمیر عمارت کے پاس ایک بھدی سی نیم تاریک دو منزلہ کوٹھی کے پورچ میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ ڈرائیونگ روم میں روشنی ہو رہی تھی۔ اور اندر سے سارنگی کی ہلکی ہلکی دلی آواز باہر آ رہی تھی۔ جاوید کے دوست نے ہارن دیا اور مسکرا کر جاوید کی طرف دیکھا۔



بٹ نے جاوید کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔

”ہاں جھمو بائی، ابھی نو گرفتار ہے۔ دو چار ملاقاتوں میں کھل جائے گا۔“

جاوید نے کہاں ہے؟“

جھمو نے بناوٹی طور پر اس ہو کر کہا۔

”ذرا طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ اندر لیٹی ہے ابھی بلائے دیتی ہوں۔“

دوسرے کمرے میں نغمہ کے پاس سینہ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور نغمہ کو جواہرات کی ایک

انگوٹھی پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”نجمہ! میری محبت کا یہ حقیر تحفہ قبول کر لو میری جان! میں بڑی امیدیں لے

کر اسے تمہارے حضور لایا ہوں۔ اگر تم نے اسے ٹھکرا دیا تو مجھے صدمہ ہو

گا۔ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکوں گا۔ میں خودکشی کر لوں گا۔“

نغمہ ہنس پڑی۔

”ہائے میری جان! تمہاری خاموشی اگر تیر بن کر میرے دل میں لگتی ہے تو

تمہاری ہنسی چھری بن کر میرے جگر سے پار ہو جاتی ہے۔ میرے لئے تو

دونوں طرف موت ہے۔ کاش! تم میری یہ انگوٹھی کا تحفہ قبول کر لو۔“

انگوٹھی سونے کی تھی اور اس میں سبز اور نیلے رنگ کے بڑے خوبصورت پتھر جڑے

ہوئے تھے۔ لیکن نغمہ کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے لئے تو وہ کالا بھنگ سینہ بھی ایک پتھر

ہی تھا جو اس کے سامنے بیٹھا اس سے اظہار محبت کر رہا تھا۔

”کیا تمہیں مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں ہے نغمہ؟“

نغمہ نے مسکرا کر کہا۔

”محبت؟ محبت کیا ہوتی ہے؟“

”ابھی غار کا دروازہ کھلے گا۔ مکمل جاسم سم اور کافر ادا نیم عریاں بھرے

بھرے جسم والی سرحد ہاتھ جام و صبو لئے رقص کرتی نمودار ہوگی۔ یہ جنت

ہے حسن بن صباح کی جنت ارضی ہے دوست! لو تم بھی ذرا سی پی لو۔“

جاوید کے دوست نے جیب سے سکاچ کا کوائر نکال کر جاوید کی طرف بڑھایا۔ جاوید

نے ہاتھ سے اسے پرے ہٹا دیا۔ اسٹن میں دروازہ آہستہ آہستہ کھلا اور پرویز نمودار ہوا۔

”اٹھا! بٹ صاحب تشریف لائے ہیں۔ آئیے آئیے۔ تشریف لائے۔“

پرویز اتنا کہہ کر جلدی سے اندر چلا گیا۔ اندر سے سارنگی کی آواز آتا بند ہو گئی۔ جب

جاوید اپنے انکم ٹیکس آفیسر دوست کے ساتھ اس دو منزلہ کونٹی کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو اس

نے دیکھا کہ سرخ قالین پر چاندنی پھیلتی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت بھاری جوڑا پہنے ٹکے کے

سہارے بیٹھی پان لگا رہی تھی۔ چلی طبلے پر گیلانا لگا رہا تھا۔ سارنگی والا سارنگی گود میں لئے بیٹھا

تھا۔ چاندی پر گلاب کے کچھ پھول ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔

”آئیے بٹ صاحب مزاج اچھے ہیں؟ آپ نے تو کبھی بھول کر بھی ہمیں

یاد نہ کیا۔“

یہ نغمہ کا مکان تھا اور یہ بات پان لگاتی ہوئی جھمو بائی نے بٹ صاحب سے کہی تھی جو

جاوید کے باپ کی کبھی بیوی یعنی جاوید کی سوتیلی ماں رہ چکی تھی۔ جاوید چپکے سے شرمایا ہوا سا ایک

طرف تلپئے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ بٹ صاحب نے کہا۔

”بس بائی جی کام ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ آج ذرا کام جلدی ختم ہو گیا۔

میں نے کہا جھمو بائی کی مزاج پرسی کر لیں۔“

جھمو بائی نے جاوید کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ برخوردار بہت شرمارہ ہے ہیں۔“

”نہیں نہیں“ او خدا یا! نہیں نہیں۔“

اور وہ باہر کی طرف بھاگ گیا۔ اس کا دوست بت، نغمہ کی ماں، پرویز اور سازندہ اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ جھمکو نے کہا۔

"کیا ہو گیا ہے اس کو \_\_\_\_\_ نغمہ ہوش کرو۔"

نغمہ نے ایک دلدوز جیج ماری اور جاوید کہہ کر اس کے پیچھے بھائی مگر پرویز نے اسے پکڑ لیا۔ نغمہ مایہ بے آب کی طرح تر پئے گئی۔ انکم ٹیکس آفیسر جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”بٹ صاحب آپ کے دوست نے اے کیا کر دیا ہے؟“

”میں \_\_\_\_\_ میں نہیں جانتا، وہ تو پہلی بار \_\_\_\_\_“

سینٹھ بھی چیخ کی آواز سن کر باہر نکل آیا۔ وہ سب ترپتی اور زار و قطار روتی ہوئی نغمہ کو سنبھالنے لگے اور انکم فیکس آفیسروہاں سے لپک کر باہر آ گیا۔ اس نے جاوید کو براہِ دے میں کھڑے ہو کر آوازیں دی۔ پھر گاڑی میں بیٹھ کر کونکھی سے باہر سڑک پر آ گیا۔ سڑک پر آ کر اس نے گاڑی ٹارنل کے کونے والے جھنڈ کے پاس کھڑی کی اور جاوید کو ڈھونڈنے لگا۔

رات آدمی بیت چکی تھی۔ شہرک اس نسبتاً خاموش علاقے کے آسمان پر تارے جھلمارہے تھے۔ سمندر کی طرف سے لہروں کے ہلکے ہلکے شور کی آوازیں آرہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کے مرطوب مہوئے نکلے چل رہے تھے۔ انکم ٹیکس آفیسر کا نشہ ہرن ہو چکا تھا۔ اس نے ایک عجیب و غریب ذرا مہما دیکھا تھا۔ ایسی باتیں اس نے پاکستانی فلموں میں دیکھی تھیں۔ حقیقی زندگی میں بھی ایسا ہو سکتا ہے یہ بات اسے آج معلوم ہوئی تھی سڑک دور تک سنسان تھی۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا میں تاریل کے جھنڈ لہرا رہے تھے۔ اندھیرے میں وہ کسی ہندو دیوتا کے سر کی جڑائیں معلوم ہو رہے تھے۔ انکم ٹیکس

سینہ نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ دیئے اور پیٹ پھلا کر گہرا سانس لیتے ہوئے سوچنے لگا کہ واقعی محبت کیا ہوتی ہے؟ ”اے خود بھی معلوم نہ تھا۔ اس نے یونہی کہا۔

”محبت ایک میٹھا میٹھا درد ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ دل میں ہوتا ہے۔ اور دونوں طرف آگ لگی ہوتی ہے تم نے وہ شعر نہیں سنا؟“

”کونسا شعر؟“

”کیا کہتے ہیں کہ دونوں طرف ہو برابر کی آگ لگی ہوئی۔“

نغمہ نے بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ جاہل دولت مند سینٹھ نے شعر کو الٹی چھری سے ذبح کر دیا تھا۔ سینٹھ نے نغمہ کا ہاتھ پکڑ کر چومنے کی کوشش کی نغمہ نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

ذرا تنگ روم میں جاوید چُپ چاپ شرمنا کر بیٹھا ہوا تھا اور اس کا دوست جیب سے ہنسکی نکال کر پنی رہا تھا اور محمو بائی اور پرویز سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ اُس نے ہنسی لے کر پوچھا ”ذرا بے بی کو بلائیں ناں بائی جی۔“

”پرویز اٹھ کر پچھلے کمرے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کا پردہ ہٹا اور بنی سنوری  
نغمہ چمن چن کرتی پاؤں کے گھنگھرو چھٹکتی نمودار ہوئی۔ نہ اس نے جاوید کو دیکھا اور نہ جاوید نے  
اس کی طرف دھیان دیا۔ اس نے جھک کر بٹ صاحب کو آداب کیا اور ابھی قریب آ کر چاندنی  
کے وسط میں بیٹھے ہی لگی تھی کہ اس کی نظر جاوید پر پڑ گئی۔ اب جاوید بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔  
ایک بل کے لیے دونوں کچھ پتھرا کر رہ گئے جیسے پتھر کے دو بت ایک دوسرے کے آمنے سامنے  
گرا دیے گئے ہیں۔ جاوید تو بھونچکا ہو کر رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ اپنی  
بیاری نغمہ کو وہاں دیکھ سکے گا۔ اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔

“نفر!”

اور وہ ایک دم اٹھا۔ نغمہ کی طرف بڑھا۔ اب اسے مطلق ہوش نہیں تھا کہ وہاں کوئی دوسرا



آؤ آؤ نغمہ! ہماری طرف آ جاؤ۔

سمندر کی شور یہ سر لہریں نغمہ کو اپنی طرف بلاری تھیں نغمہ آہستہ سے بستر میں سے اٹھی اور کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی ریشمی ساڑھی کا پلو سمندر کی طرف سے آنے والی مرطوب ہوا میں لہرانے لگا تھا۔ اس کے ماتھے پر آئے ہوئے بال اڑنے لگے۔ نغمہ کی آنکھوں میں موت کی زردی اور سادگت چہرے پر دور دراز کا غم کھلا ہوا تھا۔

کھڑکی کے باہر عقبی لان میں ریت کے ڈرے چمک رہے تھے۔ ایک دم نغمہ کو جانے کا خیال آیا کہ وہ آہستہ سے کھڑکی پر چڑھ کر پرلی طرف کود گئی۔ یہاں سے چل کر وہ کونسی کی پچھلی دیوار تک آئی۔ ایک پرانے ٹونے ہوئے میز کا سہارا لے کر اس نے دیوار پھاندی اور سمندر کی طرف بھاگنے لگی۔ ہوا تیز ہو گئی سمندر کی لہروں کا شور زیادہ بلند ہو گیا اور نغمہ تیزی سے سمندر کی طرف بھاگنے ناریل کے دو چار درخت راہ میں آئے۔ انہوں نے جبک نغمہ سے پوچھا۔

”ہماری پیاری بنی! کہاں جا رہی ہو؟ سمندر کی طرف کیوں جا رہی

ہو؟ وہاں کون تمہارا انتظار کر رہا ہے؟“

نغمہ نے کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور بھاگتی چلی گئی۔ اب سمندر کی لہروں کا شور زیادہ قریب سے سنائی دے رہا تھا۔ اندھیرا اتنا زیادہ نہ رہا تھا۔ شاید نغمہ کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئی تھیں۔ آسمان پر ستارے بڑی بے چینی سے پہلو بد لنے لگے تھے۔ سمندر آ گیا! سمندر آ گیا!

ایک طویل القامت لہر پہاڑ بن کر بلند ہوئی اور صحرا بن کر ساحل کی ریت پر دور تک چڑھ گئی۔ اس کے ٹھنڈے کھارے پانی نے بھاگتی ہوئی نغمہ کے پاؤں چوم لئے۔ نغمہ ایک پل کے لئے رک گئی۔ اس کا دم پھول گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ جب اس کا سانس درست ہوا تو اسے نے پہلے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر سمندر کی طرف! اور اس کی زبان

آفسر نے جاوید کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ مگر کسی طرف سے بھی جاوید نے جواب نہ دیا۔ آدھ گھنٹی بے سود تلاش کے بعد وہ گاڑی میں سوار ہوا اور واپس شہر کی طرف چل دیا۔

سمندر کی ایک لہر بڑے جوش سے بلند ہوئی اور ساحل کی ریت پر دور تک چڑھ گئی اور ایک پتھر پر سر جھکا کر بیٹھے ہوئے جاوید کے گھٹنوں تک پانی آ گیا۔ مگر جاوید کو کچھ محسوس نہ ہوا۔ وہ گرم سم کب سے اس پتھر پر سمندر کے کنارے بیٹھا تھا۔ اس کا ذہن اسے بار بار ایک ہی منظر دکھا رہا تھا کہ نغمہ گھٹکھڑ باندھے پردے کے پیچھے سے نمودار ہوتی ہے اور ایک ریٹیو کی طرح جھک کر آداب بجالاتی ہے اور رقص کے لئے تیار ہو جاتی ہے کہ بجلی سی گرتی ہے اور وہ دونوں پتھر کے بت بن جاتے ہیں۔ جاوید نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا تھا۔ سمندر کی لہریں شور مچاتی اس کی طرف آتی تھیں اور پھر واپس سمندر میں چلی جاتی تھیں۔ اس کے سینے میں بھی ریشمی جذبات کا تلاطم مچا ہوا تھا۔ اس کی پیاری نجمہ طوائف زادی ہو گئی۔ یہ ایک جوالا کبھی تھا جو اچانک پھٹ پڑا تھا اور جس کا کھولتا ہوا، سسکا رہتا ہوا، دکھتا ہوا والا اس کے چاروں طرف بہہ نکلا تھا۔ جاوید کے لئے اب زندہ رہنے میں کوئی کشش نہیں تھی۔ اس نے سر اٹھا کر سمندر کی طرف دیکھا۔ وہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تاروں کی ہلکی روشنی میں سمندر کی لہریں بڑی بڑی چٹانوں کی طرح اوپر اٹھ کر شور مچا رہی تھیں۔

سمندر چڑھا ہوا تھا۔ طوفانی ہور ہا تھا۔ اس طوفانی سمندر کے شوری آواز نغمہ کے کمرے میں بھی آرہی تھی۔ نغمہ کو اس کی ماں ابھی ابھی اس کے بستر میں سلا کر گئی تھی۔ مگر نغمہ کے دل و دماغ میں سینکڑوں سمندر کا جوش و خروش کروٹیں لے رہا تھا۔ اس کا جاوید اس سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس کی زندگی ایک دیران کھنڈ بن گئی تھی۔ ہرے بھرے گلزار سے ایک پل میں ریتیلے صحرا میں تبدیل ہو گئی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ کھڑکی کھلی تھی اور اس کھڑکی میں سے سمندر کی لہروں کی مسلسل آوازیں آرہی تھیں۔



پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے۔

”یا خدا! تو جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے محبت کی اور شادی کرنے کی کوشش کی۔ اپنے گناہ آلودہ ماحول سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا میں نے جاوید کو اس لئے اندھیرے میں رکھا کہ وقت آنے پر اس کو سب کچھ بتا دوں گی۔ لیکن وقت آنے سے پہلے ہی میرے آشیانے پر بجلی گر پڑی۔ تو دلوں کے حال جانتا ہے۔ تجھ پر ہر کتاب کا ہر ورق کھلا ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ میں پاک ہوں۔ باعصمت ہوں اور بے گناہ ہوں جاوید آج ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا ہو گیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اب وہ میرے پاس بھی نہیں آئے گا۔ اب میرا زندگی رہتا ہے کار ہے۔ میری موت اور زندگی میں امتیاز کا پردہ اٹھا گیا ہے۔ میں تمہارے پاس آ رہی ہوں۔ میں خودکشی کر رہی ہوں۔ مجھے معاف کر دینا۔ میرا یہ گناہ بخش دینا۔“

اتنا کہہ کر نغمہ نے آنکھیں بند کر لیں اور سمندر کے پانی میں آگے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ وہ سمندر کے پانی میں نیچے ہی نیچے ہوتی گئی۔ پہلے پانی ٹنٹوں تک تھا اب گھنٹوں تک آ گیا۔ پھر سمندر کی لہریں نغمہ کی کمر کو چھونے لگیں۔ مگر نغمہ نہ رکی اور آگے ہی آگے چلتی گئی۔ پھر اچانک ایک بڑی سی لہر اٹھی اور نغمہ کو اپنے ساتھ پہلے کنارے کی طرف لے گئی اور پھر تیزی سے بہا کر واپس سمندر میں لے آئی۔ نغمہ غوطے کھانے لگی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ پھر اسے یوں لگا جیسے کسی نے اسے اپنے بازوؤں پر اٹھالیا۔ اس کے بعد نغمہ بے ہوش ہو گئی۔

جب اسے ہوش آیا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ ریت پر لیٹی ہے۔ اس کی ساڑھی گیلی ہو گئی ہے۔ آسمانی پر تارے چمک رہے ہیں اور کوئی سایہ سا اس کے پاس سر جھکائے بیٹھا ہے۔ اسے

محسوس ہوا کہ وہ مر گئی ہے اور یہ موت کے بعد کی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ چونکہ وہ سمندر میں کود کر مری تھی اس لئے اس کی دوسری زندگی بھی سمندر کے کنارے ہی سے شروع ہو رہی ہے۔ لیکن جب اس نے دور سے کسی گاڑی کے ہارن کی آواز سنی تو ایک اکی اسے خیال آیا کہ وہ مری نہیں بلکہ کراچی کے سمندر کے ساحل پر پڑی ہے۔

اس کا سینہ درد کرنے لگا۔ اس کے منہ سے ہائے نکل گئی۔ وہ سایہ اس کی طرف بڑھا اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”نجمہ؟ نجمہ؟“

جاوید۔۔۔ جاوید۔۔۔ یہ تو جاوید کی آواز تھی۔ نغمہ نے چونک کر جاوید کو دیکھا تو بچوں کی طرح جاوید کے گلے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جاوید کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ وہ نغمہ کو اپنے سینے سے لگا کر اس کے گیلے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

”مجھے معاف کر دو جاوید۔ معاف کر دو۔ میں بے گناہ ہوں۔“

جاوید نے آہستہ سے کہا۔

”میں نے تمہاری باتیں سن لی تھیں۔ نجمہ! لیکن۔ لیکن تم نے یہ بات مجھے

پہلے کیوں نہ بتادی۔ کاش! تم نے اس کا ذکر پہلے کر دیا ہوتا۔“

”میرا ڈرتی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔“

جاوید نے نغمہ کو اپنے ساتھ لگا کر اس کا منہ چوم لیا۔

”پاگل میں کبھی تمہیں چھوڑ سکتا ہوں۔ تم تو میری جان ہو۔ اگر اتفاق

سے میں یہاں نہ ہوتا تو خدا جانے پھر کیا ہوتا۔ تم نے خودکشی کی کوشش

کیوں کی؟“

”تم سے الگ ہو کر میری زندگی کس کام کی تھی پھر؟“



دونوں محبوب ایک دوسرے کی آغوش میں سمندر کے کنارے دیر تک بیٹھے پیار و محبت کرتے رہے۔ دونوں اپنی اپنی زندگیاں ختم کرنے وہاں آئے تھے لیکن ایک نئی زندگی، نیا دلوں اور نیا جوش و خروش لے کر وہاں سے واپس ہو رہے تھے۔ جس طرح سمندر کی لہریں بیتاب ہو رہی تھیں اسی طرح اب ان کے سینوں میں زندہ رہنے، بہترین طریقے سے زندگی بسر کرنے اور جلد سے جلد ایک دوسری کی زندگیوں میں داخل ہو جانے کی تمنائیں تڑپ رہی تھیں۔ جاوید نغمہ کو چھوڑنے اس کی کوٹھی تک آیا۔ نغمہ کا اس نے منہ چوما۔ نغمہ نے اسے مسکرا کر دیکھا اور پچھلی دیوار پھاند کر کھڑکی میں سے اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ زندہ، پُر امید ہے اور جذبات سے پھر پور دل لئے اپنے کمرے میں واپس آ گئی ہے۔

جھمو بائی کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کی بیٹی جاوید سے محبت کرتی ہے۔ اور اب وہ اس کے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے اور یہ وہ کسی گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ ایک درخت کو وہ اپنی ساری زندگی، ساری جوانی کا خون دے کر بیٹھے اور جب اس پر پھل آئے تو کوئی دوسرا اس کا مالک بن کر بیٹھ جائے۔ اس نے اگلے روز سب سے پہلا کام یہ کیا کہ نغمہ کو کالج سے اٹھوایا۔ اور گھر پر بٹھلا دیا۔ اس نے اسے باہر نکلنے سے منع کر دیا۔ نغمہ اب ماں کے سامنے کچھ نہ بولی۔ اسے معلوم تھا کہ اب اس کی ماں اس کی کسی کمزوری کو معاف نہیں کرے گی۔ لیکن جب اس نے اس کی بیاہ کی تیاریاں شروع کر دیں تو وہ تھک کر رہ گئی۔ اس نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ کچھ کچھ حالات کا سینہ کو بھی علم ہو گیا تھا۔ وہ نغمہ سے اس حد تک محبت کرنے لگا کہ اب نغمہ کی جدائی اسے گوارا نہ تھی۔

وہ اب بے پناہ روپیہ خرچ کر کے بھی نغمہ سے شادی کر لینا چاہتا تھا۔ اس نے جھمو بائی سے تیس ہزار نقد ایک کوٹھی ایک کار کا وعدہ کر لیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اسے زندگی بھر ایک ہزار روپیہ مہینہ دیا کرے گا۔ جھمو بائی کے ہاتھ سے سارا زحمن جاتا دکھائی دے رہا تھا چنانچہ وہ اسی پر راضی ہو گئی تھی۔

مگر نغمہ راضی نہ ہو رہی تھی۔ اس نے نغمہ کو بے حد مارا۔ نغمہ کے جسم پر نیل پڑ گئے۔ لیکن

تھا اور کھڑکی کی موٹی موٹی لوہے کی سلاخیں تھیں۔ وہ پریشان ہو گئی اسے یوں لگا جیسے اس قید سے کبھی رہائی نصیب نہ ہوگی۔ اور وہ وہیں دم گھٹ کر مر جائے گی۔ لیکن قدرت نے یہاں بھی اس کی مدد کی۔ جس طرح قدرت ہمیشہ مصیبت زدہ سادہ دل اور نیک نفس لوگوں کی مدد کیا کرتی ہے۔ نئی نوکرائی کو جو نغمہ کا کھانا لے کر آیا کرتی تھی اس سے ہمدردی ہو گئی۔ اس نے جب نغمہ کا کھانا سنا تو اس کی مدد کرنے پر تیار ہو گئی۔ نغمہ نے کہا۔

”بڑی بی! تم پر بعد میں آفت آ جائے گی۔“

نوکرائی نے کہا۔

”زندگی میں اگر انسان کسی دوسرے انسان کے کام آ جائے تو اس سے بڑی بات اور کوئی نہیں ہوتی۔ تم میری فکر نہ کرو مینی میں تمہارے جانے کے بعد یہاں سے نوکری ہی چھوڑ دوں گی۔ میں سمجھ لوں گی کہ خدا نے مجھے صرف اس کام کے لئے یہاں بھیجا تھا کہ تمہیں اس قید سے رہائی دلاؤں۔“

نغمہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ نوکرائی نے سب سے پہلا کام یہ کیا نغمہ کے کمرے کے تالے کی ایک دوسری چابی بنوائی۔ وہ چابی اس نے اپنے پاس رکھ لی۔ چنانچہ ایک رات جب کہ گھر کے سب افراد سو رہے تھے۔ نوکرائی چپکے سے باورچی خانے سے اٹھ کر نغمہ کے کمرے کی طرف آئی۔ آہستہ سے اس نے چابی لگا کر تالا کھولا اور پت کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ نغمہ پہلے ہی تیار بیٹھی تھی۔ نغمہ نے اپنا پیٹی کیس اٹھایا اور نوکرائی کے ساتھ دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل آئی۔ دونوں نے پاؤں سلیز سلیز کر بڑی احتیاط سے چل کر کونوی کا بڑا کمرہ اور پھر برآمدہ عبور کیا اور باہر لان میں آ گئیں۔ یہاں سے انہوں نے جوتیاں پہن لیں اور تیزی سے باہر سڑک پر آ کر ایک طرف کو چل دیں۔ تاریں کے جھنڈ کے پاس پروگرام کے مطابق جاوید گاڑی لئے پہلے سے کھڑا

وہ یہی کہتی رہی کہ شادی صرف جاوید سے کروں گی۔ میں سینھ کے ہاتھ نہیں رکھوں گی۔

”تم میری کھال ادھیڑ سکتی ہو ماں مگر میرا سودا نہیں کر سکتیں۔ میں نے محبت کی ہے۔ اپنی زندگی کا ساتھی تلاش کیا ہے۔ کوئی گناہ نہیں کیا میں شریف عورت بن کر زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں کسی میاش مرد کی داشت بن کر نہیں زندہ رہنا چاہتی کہ جب اس کا دل بھر جائے تو مجھے گھر سے باہر نکال دے۔“

ماں نے گرج کر کہا۔

”میں بھی تمہاری شادی کر رہی ہوں۔ سینھ تمہیں دلہن بنا کر گھر لے جائے گا۔ وہاں زندگی بھر عیش کرو گی۔“

بہن نے تڑپ کر کہا۔

”عیش میں کروں گی ماں یا تم۔“

”بکو اس بند کرو۔“

ماں نے زور سے ایک طمانچہ مارا۔ نغمہ پلنگ پر گر پڑی اور رونے لگی اور یہی کہتی رہی کہ میں ہرگز ہرگز اس سینھ سے بیاہ نہیں کروں گی۔ ماں نے اسے زور سے لات ماری اور اتنا کہہ کر غصے میں پھنکارتی باہر نکل گئی۔

”میں دیکھتی ہوں کہ تو کیسے شادی نہیں کرتی۔“

جھمور نے پرویز سے مل کر فیصلہ کیا کہ لڑکی کو باندھ کر سینھ کے ساتھ روانہ کر دیا جائے۔ بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ انہوں نے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سینھ سے شادی کی تیاریوں کے لئے چند ہزار روپے بھی لئے۔ اب نغمہ کے سامنے صرف ایک ہی مسئلہ تھا کہ کسی طرح جاوید کو حالات سے باخبر کر دیا جائے۔ مگر اس پر سخت پہرہ تھا۔ دروازے پر باہر تالا پڑا رہتا



”ہائے ری میری ماں! چابی تو میرے آزار بند سے بندھی تھی۔ تالا کیسے کھل گیا۔“

پرویز نے کہا۔

”انہوں نے دوسری چابی بنوائی ہوگی۔ خیر!۔ رونے سے کچھ نہ ہوگا۔ میرے ساتھ فوراً چلو۔ پولیس کو اطلاع کرتے ہیں۔ جلد اٹھو۔“

انہوں نے اسی وقت جا کر پولیس کو اطلاع کر دی کہ ان کی بیٹی گھر سے سارے زیورات لے کر گم ہو گئی ہے۔ پرویز نے شہر میں اپنے تمام جاسوسوں کو باخبر کر دیا۔ انکم ٹیکس آفیسر سے مل کر اس نے جاوید کا پتہ کیا اور اس کی کونھی پہنچا۔ وہاں سے اسے معلوم ہوا کہ جاوید لاہور جا چکا ہے۔ پرویز کو معلوم تھا کہ نغمہ جاوید کے ساتھ ہی جائے گی۔ وہ فوراً اپنے آدمیوں کو لے کر ہوائی اڈے پہنچ کر چھپ کر بیٹھ گیا۔

ادھر جاوید اور نغمہ نے بڑی بی کو کوئٹے رخصت کیا اور خود گاڑی میں بیٹھ کر ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔ نغمہ نے برقعہ اوڑھ رکھا تھا۔ ہوائی اڈہ وہاں سے کافی دور تھا۔ جاوید بڑی تیز گاڑی چلا رہا تھا ابھی وہ بمشکل چھ سات میل ہی گیا ہوگا کہ گاڑی خراب ہو گئی۔ انجن میں نقص پیدا ہو گیا اور گاڑی نے آگے چلنے سے انکار کر دیا۔ جاوید اور نغمہ پریشان ہو گئے۔ نغمہ نے کہا۔

”اب کیا ہوگا۔ یہاں تو کوئی سواری بھی نہیں مل سکے گی۔“

جاوید نے رومال سے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھ کر کہا۔

”فکر نہ کرو۔ ابھی کوئی گاڑی آ جائے گی۔“

”جہاز کس وقت اڑتا ہے؟“

”ابھی بیس منٹ باقی ہیں۔“

”یا اللہ! اب کیا ہوگا۔“

تھا۔ دونوں گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ اور گاڑی کراچی شہر کی طرف اڑنے لگی۔

نغمہ نے وہ رات نوکرائی بڑی بی کی کنیا میں بسر کی۔ جاوید اپنے گھر چلا گیا۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ اگلے روز وہ جہاز میں سوار ہو کر لاہور جائیں گے۔ وہاں جاوید کا ایک گہرا دوست رہتا تھا۔ اس کے ہاں جا کر شادی کر لیں گے اور پھر بنی منی منانے کو مری روانہ ہو جائیں گے۔ جاوید نے اپنے مجسٹریٹ باپ احمد کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ لاہور ایک کام سے جا رہا ہے۔ بڑی بی نے کہا۔

”خدا تمہیں شادی مبارک کرے جینا۔“

نغمہ نے بڑی محبت سے کہا۔

”اماں تم بھی ہمارے ساتھ چلی چلو۔ تم کہاں جاؤ گی؟“

”یہ وہ لوگ تمہیں تلاش کرتے میرے ہاں ضرور آ جائیں گے۔ اس لئے

میں بھی صبح یہاں سے کوئٹہ اپنی بیٹی کے پاس چلی جاؤں گی۔ میری تم جیسی

ہی ایک بیٹی ہے میں اس کے بچوں کی دیکھ بھال کروں گی۔“

جب رات گزر گئی۔ صبح ہوئی اور چھمبائی نے منہ ہاتھ دھو یا تو غسل خانے سے واپس

اپنے کمرے میں آتے ہوئے اس کی نظر جو نغمہ کے کمرے پر پڑی وہ دھک سے رہ گئی۔ کمرے کا

تالا کھلا تھا اور وہ سوائے خالی بستر کے اور کچھ نہ تھا۔ وہ تو سر پکڑ کر وہیں کی وہیں بیٹھ گئی۔ سونے کی

چڑیا اڑ گئی تھی اور بنجرہ خالی رہ گیا تھا۔ اس کی گریہ زاری کی آواز سن کر پرویز اور سازندے وہاں

دوڑے دوڑے آئے۔ انہوں نے بھی جب نغمہ کو غائب پایا تو حیران رہ گئے۔

”یہ کیسے ہو گیا۔ بڑی بی کہاں ہیں؟“

پرویز نے ساری کونھی چھان ماری۔ نوکرائی کا کہیں سراغ نہ ملا۔ وہ سمجھ گئے کہ نوکرائی

نغمہ کو بھگا کر لے گئی ہے۔ چھمبائی نے سر پر دو ہتھ مار کر کہا۔

”فکر نہ کرو نفوس۔“

اتنے میں دور سے جاوید کو ایک بڑی گاڑی آتی دکھائی دی۔ جاوید سڑک کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ اس نے گاڑی روک لی۔ یہ گاڑی روک لی یہ گاڑی سینٹ کی تھی اور علی اکبر یعنی نفقہ کا باپ اس گاڑی کو چلا رہا تھا۔ علی اکبر نے سر باہر نکال کر پوچھا۔

”کیا بات ہے بیٹا؟“

”باباجی! ہمیں ہوائی اڈے پہنچنا ہے۔ ہماری گاڑی خراب ہو گئی ہے اور جہاز چلنے میں بیس منٹ باقی ہیں۔“

علی اکبر نے کہا۔

”بیٹھ جاؤ بیٹے۔ میں لیے چلتا ہوں۔“

نفقہ اور جاوید جلدی سے کار میں سوار ہو گئے۔ اور کار ہوائی اڈے کی طرف چلنے لگی۔ بد نصیب باپ کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ پچھلی سیٹ پر اس کی بیٹی نفقہ بیٹھی ہے جس کی جدائی کے غم نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ اتنا بوڑھا اور سفید کہ نفقہ بھی اپنے باپ کو نہ پہچان سکی۔ کار ہوائی اڈے کی جانب اڑی جا رہی تھی۔

اچانک سامنے سے آتی ہوئی ایک دوسری کار نے انہیں ہاتھ دے کر روک لیا۔ جاوید نے کہا۔

”باباجی روکے نہیں۔ جلدی چلے خدا کے لئے۔“

علی اکبر نے کہا۔

”بیٹے یہ میرا مالک ہے میں رکنے پر مجبور ہوں۔“

دوسری کار سے بھدا تو ندیل سینٹ برآمد ہوا۔ برقعے میں بیٹی ہوئی نفقہ کی جان ہوا ہو گئی۔ اس کا بدن سرد پڑ گیا۔ یا اللہ خیر یہ کیا ہو رہا ہے۔ سینٹ تو ند باہر نکالے علی اکبر کے پاس آیا اور

غصے سے بولا۔

”تم نے دیر کیوں کر دی؟“

علی اکبر نے عاجزی سے کہا۔

”سینٹ صاحب میری بیٹی کے بچہ ہونے والا تھا میں اسے لے کر بڑے

ہسپتال جا رہا ہوں۔ اس لئے دیر ہو گئی۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی

بچی کو ہسپتال چھوڑ آؤں۔“

سینٹ نے اندر جھانک کر برقعے میں لپٹی ہوئی نفقہ کو دیکھا۔ نفقہ نے جب ڈرائیور کی یہ ہوشیاری دیکھی تو فوراً سر پیچھے سیٹ سے لگا دیا اور غیر ارادی طور پر ادھر ادھر دو ایک بار سر مارا جیسے بڑی تکلیف میں ہو۔ بعد میں اسے اپنی اس حرکت پر بے حد شرم محسوس ہوئی۔ وہ تو شکر ہوا کہ اسے اس طرح کرتے جاوید نے نہ دیکھا تھا۔ سینٹ جاوید کو پہچانتا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ اس رات وہ اس وقت نفقہ کی چیخ سن کر باہر آیا تھا۔ جب جاوید باہر نکل چکا تھا۔ سینٹ نے دانت نہیں کر کہا۔

”انہیں چھوڑ کر جلدی واپس آنا؟“

”بہت اچھا سر کاڈ۔“

علی اکبر نے گاڑی سٹارٹ کی اور ہوائی اڈے کی طرف چل پڑا۔

جاوید نے کہا۔

”باباجی آپ نے کمال کر دیا اس وقت اگر آپ یہ بہانہ نہ بناتے تو ہمارا

جاننا ناممکن تھا۔“

علی اکبر نے آزرہ لہجہ میں کہا۔

”مجھے اپنی بیٹی کا خیال آ گیا تھا بیٹے۔“

”آپ کی بیٹی کہاں ہے؟“



”یہ کون صلبہ ہیں؟“

علی اکبر نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”میری بیٹی ہے انہیں ہسپتال چھوڑنے جا رہا ہوں۔ میرا بیٹا اندر فون

کرنے گیا ہے۔“

نغمہ کا دل اچھل کر حلق سے کے پاس آ گیا۔ اب اسے سب سے زیادہ اس بات کا

اندیشہ تھا کہ اگر جاوید فون کر کے پرویز کے سامنے بی باہر آ گیا تو سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور وہ

دونوں ابھی پکڑ لئے جائیں گے۔ وہ خدا سے دعائیں مانگنے لگی۔ کہ یا اللہ پرویز چلا جائے اور

جاوید ابھی اندر سے باہر نہ نکلے۔ مگر پرویز علی اکبر ڈرائیور سے باتیں کر رہا تھا۔ اور بار بار مشتتبہ

نگاہوں سے پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی نغمہ کو دیکھ لیتا تھا۔ خدا خدا کر کے پرویز وہاں سے چلا گیا۔ نغمہ کی

جان میں جان آئی۔ وہ اسے جاتے دیکھتی رہی۔ سامنے بڑی سڑک پر جا کر وہ اپنے ساتھیوں

سمیت ایک ٹیکسی میں سوار ہوا اور وہاں سے دفعاں ہو گیا۔ نغمہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور ڈرائیور

سے کہنے لگی۔

”بابا آپ ہمارے لئے جھوٹ کیوں بول رہے ہیں؟“

علی اکبر نغمہ کی آواز سن کر چونک سا گیا۔ اس کے ذہن میں پکڑے کے کارخانے کی

مشینیں چلنے لگیں۔ پھر چھنی کا بھونپو بجا اور پھر وہ اپنی بیٹی کو لے کر روٹی کھانے باہر آیا اور وہ

پانی لینے گئی اور پھر اچانک اسے روٹی والے ڈبے کے قتل کے فرش پر چھن سے گرنے کی آواز

سنائی دی۔

”بابا آپ خاموش کیوں ہو گئے؟“

”ہوں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں بیٹی۔ مجھے کچھ یاد آ گیا تھا۔“

”کیا یاد آ گیا تھا بابا؟“

”اگر آج وہ میرے پاس ہوتی تو اس کے بھی بچے ہوتے اور میں انہیں

کندھے پر بٹھا کر کھنسن کی سیر کروایا کرتا۔“

”وہ کہاں ہے بابا جی؟“

علی اکبر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور صرف اتنا کہا۔

”شاید اللہ میاں کے پاس۔“

پھر وہاں خاموشی طاری ہو گئی۔ جاوید اور نغمہ اپنے خیالات میں پریشان تھے۔ انہوں

نے علی اکبر بابا کے غم کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ انہیں سب سے بڑا فکر یہ تھا کہ کس طرح ہوائی

اڈے پہنچ کر لاہور کا جہاز پکڑ لیں۔ ٹکٹ وہ خرید چکے تھے۔ مگر صد افسوس کہ جس وقت ان کی گاڑی

ہوائی اڈے کے پورچ میں پہنچی تو لاہور جانے والا ہوائی جہاز رن وے سے اڑ کر فضا میں چکر لگا کر

لاہور کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ جاوید کے چہرے پر ناامیدی چھا گئی۔ نغمہ دل کو پکڑ کر رہ گئی۔

”جہاز نکل گیا ہے بابا! اب اگر آپ اتنی سی زحمت کرویں کہ بی بی کو گاڑی

میں لے کر یہاں ٹھہریں میں ذرا ایک فون کر آؤں تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

”کوئی بات نہیں بیٹا! تم بے شک فون کر آؤ۔“

جاوید نے نغمہ کو تسلی دی اور خود اندر فون کرنے چلا گیا۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہے کہ کہیں

پرویز اپنے دو تین ساتھیوں کے ساتھ ان کی گاڑی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔

ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے وہ سمجھ گئی کہ اب اسے دنیا کی کوئی طاقت پرویز کے پنجے سے نجات نہیں

دلا سکتی۔ لیکن وہ برقعہ اوڑھے ہوئی تھی۔ پرویز اسے نہ پہچان سکا۔ مگر علی اکبر یعنی سیٹھ کے ڈرائیور کو

پہچان کر اس کی طرف آیا اور سیٹھ کا در یافت کیا کہ وہ کونسی بیٹی ہیں یا نہیں؟

علی اکبر نے کہا۔ ”ابھی ابھی گئے ہیں۔“ پرویز نے پیچھے جھانک کر برقعہ میں اپنی

عورت کو دیکھ کر پوچھا۔

”تم کیوں پریشان ہوتی ہو بیٹی! تم اگر چاہو تو میرے جھونپڑے میں رات بسر کر لو۔ غریب سا گھر ہے۔ تم لوگوں کو تکلیف تو ہوگی۔ لیکن میرا گھر حاضر ہے۔“

جاوید نے سوچا کہ یہ اچھا ہوگا۔ اب وہ واپس گھر بھی نہیں جاسکتا۔ اور کسی دوست کے ہاں وہ نفعہ کو لے کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ اس میں بات باہر نکل جانے کا اندیشہ تھا۔ اس نے کہا۔

”بہت اچھا بابا! ہم تمہارے ہاں رات بسر کر لیں گے اور صبح ہوائی اڈے آ جائیں گئے۔“

علی اکبر پہلے سینھ کی کوئی میں رہا کرتا تھا۔ لیکن بعد میں وہ اس کوئی کے بالکل ساتھ ہی ایک کوارٹر میں آ گیا۔ جب وہ گاڑی لے کر سینھ کی کوئی کے قریب سے گذر تو نفعہ کی جان ہی نکل گئی۔ اس نے فوراً کیا۔

”خدا کے لئے ادھر نہ جاؤ بابا!“

”کیوں بیٹی؟ ادھر کیا ہے؟ وہ سانسے میرا کوارٹر ہے۔“

گاڑی کوئی سے کوئی آدھ فرلانگ کے فاصلے پر چھوٹے سے تالے کے پل کی دوسری جانب ایک بوسیدہ سے کوارٹر کے باہر کھڑی ہو گئی۔ نفعہ اور جاوید جلدی سے گاڑی میں سے اتر کر کوارٹر میں داخل ہو گئے۔

”تم لوگ اندر بیٹھو میں گاڑی چھوڑ کر ابھی آتا ہوں۔“

کوارٹر صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ جس کے باہر تنگ سا گندہ صحن تھا۔ اندر ایک چار پائی بچھی تھی پڑانی میز کوٹنے میں پڑی تھی جس پر کچھ برتن سجے ہوئے تھے۔ نفعہ نے برقعہ اتار دیا اور چار پائی پر بیٹھ گئی۔ جاوید نے کوٹنے میں سے لوہے کی کرسی اٹھا کر قریب کی اس کی گرد

”بہت کچھ یاد آ گیا تھا۔ یوں لگا جیسے میری بیٹی مجھے آواز دے رہی ہے۔“

پھر علی اکبر کے چہرے پر زہر خند نمودار ہوئی۔ اس نے اپنا سر آہستہ سے جھٹک دیا اور گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ اتنے میں اندر سے جاوید آ گیا۔ علی اکبر انہیں لے کر واپس روانہ ہو گیا۔ اس نے پوچھا ”بیٹا اب کہاں چلو گے؟“

جاوید نے کہا۔

”بابا! تم ہمارے لئے پریشانی نہ اٹھاؤ ہمیں شہر میں کسی جگہ اتار دو۔ ہم کہیں نہ کہیں چلے جائیں گے۔“

علی اکبر کہنے لگا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔ جانے کیوں تم دونوں سے مجھے اپنے بچوں کی طرح پیار ہو گیا ہے۔ میں تمہیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا۔ شاید یہی محبت ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے کچھ گیان ہوا ہے کہ تم دونوں گھر سے بھاگ کر جا رہے ہو۔“

”بابا! تمہارا قیافہ بالکل درست ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے ماں باپ ہماری شادی کے خلاف ہیں۔ چنانچہ ہم کراچی سے بھاگ کر لاہور شادی کرنے جا رہے تھے۔“

نفعہ نے کہا ”اور اب ہمیں یہ پریشانی ہے کہ کہاں جا کر آج کا دن گزاریں تاکہ اگلے روز جہاز میں سوار ہو سکیں۔“

علی اکبر نے نفعہ کی آواز سنی تو ایک بار پھر اس کا دل زور زور سے دھڑکا اور اسے روٹی

کے ڈے کے پل کے فرش پر گرنے کا جھٹکا کاٹا، دبا۔ اس کے منہ سے آواز نکلا



مر گئی ہے۔

علی اکبر بسائے سے دو چار پائیاں مانگ لایا۔ ایک چار پائی اس نے اندر بچھادی اور اپنی کھات باہر صحن میں ڈال دی۔ وہ خود ہونٹ سے ان کے لئے کھانا لایا۔ جاوید نے پیسے دینے چاہے تو اس نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

”میری جینی گھر آئے اور میں اس سے کھانے کے پیسے وصول کروں؟“

جاوید بیٹا تم میری تو جین تو نہ کرو۔“

”معافی چاہتا ہوں“

رات کو کھانا کھا کر جاوید اور نغہ اندر کوٹھڑی میں سوئے اور بابا باہر سویا چھڑوں کی وجہ سے وہ دونوں ساری رات نہ سو سکے۔ صبح ہوئی علی اکبر کسی بہانے گاڑی لے آیا۔ نغہ نے برقعہ پہنا اور جاوید کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ علی اکبر گاڑی کو لے کر سینھ کی کوٹھی کے سامنے سے گذر اور ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔ جاوید نے پہلے روز ہی ٹکٹ دوسرے دن کی فلائٹ کے کروالنے تھے۔ وہ ہوائی اڈے پر بیس منٹ پہلے پہنچ گئے۔ علی اکبر انہیں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ نغہ اور جاوید لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔

جس وقت وہ اندر داخل ہو رہے تھے تو پرویز ان دونوں کو ایک طرف ستون کے عقب میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ جاوید کے ساتھ برقعہ میں لپٹی ہوئی نغہ ہی ہے۔ وہاں بیٹھ کر وہ چائے پینے لگے۔ کچھ دیر بعد جاوید فون کرنے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کوئی دو منٹ بعد جب وہ سگریٹ منہ میں دبائے واپس لاؤنج میں آیا تو نغہ وہاں نہیں تھی۔ اُس نے حیرانی سے چاروں دیکھا نغہ کہیں بھی نہیں تھی۔

جھاڑی اور بیٹھ کر سگریٹ ساگالیا۔

”معاذ خراب ہوتے ہوتے بچ گئے ہم تو۔ یہ بابا تو فرشتہ رحمت بن کر نازل ہوا ہے نجمہ۔“

”کیوں نہیں بڑا اور مند آدمی ہے۔ مجھے جینی جینی کہتے اس کی زبان نہیں سوکھتی۔ لیکن یہ بڑی مصیبت کی بات ہوئی ہے کہ ہم عین دشمن کے محاذ کے نیچے آ کر بیٹھ گئے ہیں۔ جس سینھ سے میری شادی ہو رہی تھی۔ یہ بابا اس کا ڈرائیور ہے اور اس کی کوٹھی یہاں سے صاف دکھائی دیتی ہے۔“

جاوید نے کہا۔

”جانتا ہوں تم اس کی پرواہ کرو۔ یہاں تمہارا کوئی بال تک بچا نہیں کر سکتا۔ بابا انتہائی شریف اور قابل اعتماد آدمی ہے۔“

اتنے میں علی اکبر آ گیا۔ اس نے جب نغہ کو بغیر برقعہ کے دیکھا تو ایک بار پھر اس کے جذبہ پداری نے جوش مارا۔ جانے اسے دیکھتے ہی اسے کیا ہو گیا اس کا دل خود بخود اس لڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے نغہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔

”اگر آج میری جینی زندہ ہوتی تو بالکل تمہاری جتنی ہوتی۔ اس کی آنکھیں تو بالکل تمہاری طرح تھیں۔“

نغہ مسکرانے لگی۔

”میں بھی تمہاری جینی ہوں بابا۔“

علی اکبر نے اتنا اور شدت جذبات سے آنکھیں بند کر لیں اور اس کی پلکوں سے آنسوؤں کے دو قطرے اس کی تان کی وردی میں گر کر جذب ہو گئے۔ جاوید نے نغہ کو اشارے سے منع کیا کہ وہ اس کی مرحوم جینی کا ذکر بار بار نہ کرے۔ دونوں کا یہی خیال تھا کہ بابا کی کوئی بیٹی تھی جو

کوئی لڑکا نہیں تھا۔ معمر الجھتا چلا جا رہا تھا۔ جاوید اٹھ کر واپس چل پڑا۔ گھر جا کر اس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ لاہور سے واپس آ رہا ہے۔ اب اس کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ نفع کی کوٹھی چل کر اس کا پتہ چلایا جائے۔ مگر کیا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے انہوں نے پولیس میں اغوا کی رپٹ درج کروادی ہو۔ اور نفع کو اپنے طور پر اس لئے اغوا کر لیا ہو کہ عدالتی کارروائی سے محفوظ رہا جاسکے۔ اس نے اپنے انکم ٹیکس افسر دوست سے مدد لی اور سے چھمو بائی کے گھر روانہ کیا۔ اس نے واپس آ کر اطلاع دی کہ وہاں تالا لگا ہے۔ اب جاوید کو علی اکبر ڈرائیور کا خیال آیا۔ سینھ جاوید کی شکل سے ناواقف تھا۔ چنانچہ اس نے ٹیکسی لی اور سیدھا سینھ کی کوٹھی کے سامنے ہو کر علی اکبر کے کوارٹر میں آ گیا۔ علی اکبر دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کر رہا تھا۔ جاوید کی آواز سن کر وہ فوراً باہر آیا۔ جب اسے نفع کی گمشدگی کا علم ہوا تو وہ بھی حیران ہو گیا۔ اب جاوید نے علی اکبر کو معاملہ کھول کر بیان کر دیا۔ اس نے اسے بتا دیا کہ نفع چھمو بائی طوائف کی بیٹی ہے اور سینھ سے اس کی شادی ہونے والی تھی جس کی وجہ سے وہ دونوں لاہور فرار ہو رہے تھے۔

”بابا! جہاں تک میرا خیال ہے نجمہ کو ہوائی اڈے سے سینھ کے آدمیوں

نے اغوا کیا ہے میں نے کوٹھی سے بھی پتہ کروایا ہے وہاں کوئی نہیں۔ تم

سینھ کے ہاں پتہ کرو کہ نجمہ وہاں تو نہیں آگئی۔“

”میں ابھی جا کر معلوم کئے دیتا ہوں۔ تم میرے کوارٹر میں ٹھہرو۔“

جاوید چار پائی پر بیٹھ گیا اور علی اکبر نفع کا سراغ لگانے سینھ کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔

کوٹھی میں آ کر اسے معلوم ہوا کہ سینھ کھانا کھانے کے بعد آرام کر رہا ہے اور گھر میں سوائے سینھ کی بیوی اور بچی کے اور کوئی عورت نہیں ہے۔ علی اکبر نے واپس آ کر جاوید کو خبر دی کہ نفع وہاں بھی

نہیں پہنچی۔ جاوید بے حد مایوس ہو گیا۔

”خدا جانے اسے کہاں لے جایا گیا ہے۔ وہ کس حال میں ہے؟ کہاں ہے؟“

جاوید نے ہوائی اڈے کے دفاتر کا کونہ کونہ چھان مارا مگر نفع کا کہیں سراغ نہ ملا۔ وہ

حیران تھا کہ دو منٹ کے اندر اندر ایک نفع لاؤنج میں سے کہاں گم ہو گئی۔ اس نے لاؤنج میں

آ کر ارد گرد لوگوں سے پوچھا بھی مگر کوئی شخص اسے خاطر خواہ جواب نہ دے سکا۔ کسی نے کہا اس

نے کسی لڑکی کی وہاں نہیں دیکھا۔ کسی نے کہا وہ ابھی آ کر بیٹھا ہے۔ اس دوران میں لاہور جانے

والا جہاز مسافروں کو لے کر اپنے سفر پر روزانہ ہو گیا۔ جاوید دل گرفتہ ہو کر ایک کرسی پر اکیلا بیٹھ

گیا۔ اور دو روز کے تیزی سے تبدیل ہونے والے حادثات کی نوعیت پر غور کرنے لگا۔ اس کا خیال

سینھ کے ڈرائیور علی اکبر کی طرف بھی گیا۔ لیکن وہ شخص اسے دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ اسے اگر دھوکا

دینا ہوتا تو وہ اپنے کوارٹر میں ہی ان کی خبری کرویتا اور وہیں گرفتار کروا دیتا۔ اکیلی نفع وہاں سے مل

نہیں سکتی تھی۔ یقیناً اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ اسے اس کی ماں اور سینھ کے آدمیوں

نے اغوا کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دن دہاڑے ایک جوان عورت کو لاؤنج کی رونق میں سے

زبردستی کیسے اغوا کیا جاسکتا ہے؟

لاؤنج کے کاؤنٹر بوائے سے اسے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اس نے سامنے والے

دروازے میں سے ایک لڑکے کے ساتھ برقعہ پوش خاتون کو باہر نکلتے دیکھا تھا۔ مگر نفع کے ساتھ



ہو گئی ہے۔ وہ بڑے آرام سے نفع کو اٹھائے ہوئی اڈے کے بڑے ہال سے باہر سڑک پر آ کر گاڑی میں سوار ہوئے اور گاڑی اڑاتے ہوئے کونٹری میں آ گئے یہاں مہمو بانی پہلے سے موجود تھی۔ اس نے نفع کو واپس آتے دیکھا تو خوشی سے بارغ بارغ ہو گئی۔ پرویز نے کہا۔

”آج کے دن کے لئے میرے مکان میں چلی چلو۔ یہاں آج تالا لگنا چاہیے۔“  
”وہ کس لئے؟“

”تم باتیں نہ بناؤ مہمو اور جیسے میں کہتا ہوں ویسے کئے جاؤ۔“

چنانچہ پرویز بے ہوش نفع کو ساتھ لے کر اپنے فلیٹ پر آ گیا۔ یہاں انہوں نے اسے پتنگ پر لٹا دیا۔ کوئی گھنٹہ بعد نفع کو ہوش آیا تو اپنے سامنے جاوید کی بجائے پرویز اور اپنی ماں کو دیکھ کر اس کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی مگر اب وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ ایک بار پھر وہ ان لوگوں کی قید میں آ کر پھنس گئی تھی اور اس بار اس کا وہاں سے نکلتا مشکل تھا۔ کیونکہ ظاہر ہے اس پر پابندیاں سخت کر دی جائیں گی۔

رات کو نفع نے کچھ نہ کھایا۔ اسے جاوید کا خیال بار بار ستار ہا تھا۔ بے چارہ جب فون کر کے واپس آیا ہوگا تو اسے غائب پا کر کس قدر حیران اور پریشان ہوا ہوگا۔ جانے اس وقت وہ کہاں ہے۔ اور کس حالت میں ہے۔ رات بھر نفع پریشان رہی۔ اس کے ذہن میں بار بار ہوائی اڈے کے لاؤنج کا نقشہ کھینچتا رہا۔ صبح مہمو بانی نے اسے ناشتہ کروانے کی بہتری کوشش کی مگر نفع نے انکار کر دیا۔ یہ بھوک ہڑتال کی ایک اور مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔ لیکن پیٹ بڑی بلا ہے۔ آدمی لاکھ چاہے مگر اس خور کی آگ بجھانی ہی پڑتی ہے۔ چنانچہ دوسرے روز شام کو نفع نے دودھ پی لیا اور رات کو ہلکا سا کھانا بھی کھالیا۔ مہمو بانی کی جان میں جان آئی۔

تجربہ کار عورت نے سینہ کو اس انوا کی کانوں کان خبر نہ ہونے دی تھی۔ نفع کی بیماری کا

”خود ملے رکھو بیٹا! خدا نے چاہا تو وہ بہت جلد تمہیں مل جائے گی۔ اس سلسلے میں مجھ سے جو کچھ بھی ہو۔ کام میں ضرور کر گزروں گا۔ کم از کم سینہ کے ہاں وہ جس وقت آئی میں فوراً تمہیں اس کی اطلاع کر دوں گا اور کونٹری میں بھی اس کا خیال رکھوں گا۔“

جاوید نے علی اکبر کو اپنا خاص فون نمبر دیا اور شکر یہ ادا کر کے ٹیکسی میں بیٹھ کر واپس گھر آ گیا۔

جس وقت جاوید فون کرنے دوسرے کمرے میں گیا تو نفع لاؤنج میں اکیلی رہ گئی۔ وہ بڑے اطمینان سے بیٹھی تھی۔ نکت اس کے بٹوے میں تھے۔ لاہور جانے والا ہوائی جہاز تیار کھڑا تھا۔ چائے وہ پی چکی تھی اور اب صرف جاوید کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ باہر آئے اور یہ اس کے ساتھ ہوائی جہاز میں جا کر سوار ہوا جائے۔ اتنے میں ایک دس گیارہ برس کا لڑکا اس کے پاس آیا اور بولا۔

”نجمہ بی بی آپ کا نام ہے؟“

نفع نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں کیوں کیا بات ہے؟“

”بابو جاوید نے آپ کو ادھر بلا دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جہاز تیار ہے فوراً سامنے والے کمرے سے باہر ہو کر باہر آ جائیں۔“

نفع بغیر کچھ سوچے جلدی سے اٹھی اور لڑکے کے ساتھ ایک تنگ سے برآمدے میں گزر کر ایک کمرے میں پہنچ گئی۔ لڑکا غائب ہو گیا اور اس نے دیکھا کہ وہ زنانہ باتھ روم میں آ گئی ہے۔ اچانک کسی نے اس پر کمبل ڈالا اور کسی دوائی کی تیز بو اس کے نھنوں میں گھلنے لگی۔ اس کے بعد وہ بیہوش ہو گئی۔ پرویز نے اپنے ساتھیوں سے مل کر نفع کو بڑی احتیاط سے اٹھایا اور باہر لے آئے۔ انہوں نے لوگوں پر یہ ظاہر کیا کہ ان کی عورت اچانک ماں کے انتقال کی خبر سن کر بے ہوش



بہانہ بنا کر اس سے شادی کی تاریخ کو تھوڑا سا بڑھا دیا۔ دراصل وہ نغمہ کا اچھی طرح سے جی بھلاتا چاہتی تھی اور جاوید کی یاد اس کے دل سے نکال دینا چاہتی تھی۔ دو روز بعد وہ اپنی کونھی میں نغمہ کو لے کر آگئی۔ بظاہر اس نے نغمہ کو قید میں ڈالا تھا۔ لیکن اس بار اس پر بڑی سخت پابندی تھی۔

پرویز اپنے آدمیوں کو ہر وقت کونھی کے سامنے پہرے پر موجود رکھتا تھا جو ہر آنے جانے والے پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ نغمہ کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ فون گھر پر تھا ہی نہیں۔ نوکر کو اتنی اجازت نہ تھی کہ وہ کسی کا خط لے کر باہر نکل سکے۔ پرویز نے ور پردہ یہ بات نغمہ کے کانوں تک پہنچا دی تھی پہلے جاوید کو اور پھر نغمہ کو ہلاک کر دے گا۔ نغمہ کو اپنی جان کی پروا نہ تھی۔ لیکن اسے جاوید کی زندگی کا زیادہ خیال تھا۔ وہ اس کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتی تھی۔ مگر عشق اگر سچا ہو تو تلواروں کی چھواؤں میں بھی وہ اپنا کام کر کے رہتا ہے۔ نغمہ نے بھی جاوید تک کسی نہ کسی طرح ایک خط پہنچا دیا۔ خط صبح کی ڈاک جاوید کو ملا۔ اس خط میں نغمہ نے ساری تفصیل لکھی تھی کہ کس طرح وہ فون کرنے اندر گیا تو ایک لڑکا آیا۔ پھر کیسے وہ دھوکا دے کر اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ پھر اسے بیہوش کر کے گھر پہنچا دیا گیا۔ آخر میں اس نے لکھا تھا کہ میری ماں نے میری صحت یا کسی مصلحت کے خیال سے میری سیٹھ سے شادی کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوا اگر اس اثنا میں تم کسی کے ہاتھ والد صاحب کی جانب سے شادی کا پیام بھجوادو۔ تمہارے والد کا بڑا بلند مرتبہ ہے۔ شاید میری ماں تمہارے والد کے اونچے مرتبے کے خیال سے اور کچھ میری پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہاں کر دے اور یہ شادی نہایت خوش اسلوبی سے پرسکون ماحول میں باجوں کے ساتھ انجام پائے۔

جاوید نے خط پڑھ کے پہلے تو خدا کا شکر ادا کیا کہ نغمہ اپنے گھر محفوظ ہے۔ پھر وہ شادی کا پیغام بھجووانے کے پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔ اس کا باپ اپنے بیٹے سے بڑا پیار کرتا تھا۔ ماں باپ کا وہ اکلوتا بیٹا تھا۔ سوال صرف یہ تھا کہ کیا وہ ایک طوائف کی بیٹی سے اس کا بیاہ کرنے پر راضی ہو

جائے گا؟ جاوید کو اس پر شک تھا۔ اگرچہ اس کا باپ بڑا وسیع القلب انسان تھا۔ مگر اسے شبہ تھا کہ وہ نغمہ سے شادی پر راضی ہو جائے۔ اس کے باوجود اس نے باپ سے بات کرنے کا پکارا رواہ کر لیا۔ نغمہ نے خط لکھ دیا تھا۔ کہ اس کی ماں اب اس سے ناچ گانا نہیں کرواتی۔ سیٹھ نے روپیہ دینا شروع کر دیا ہے اور اس کے حکم سے گھر سے طبلے سارنگیاں اشرافی گئی ہیں اور سازندوں کو نوکر بنی سے جواب دے دیا گیا ہے۔ اور اس کی ماں نے مذہبی آیات کے قطعے کمرے میں لٹکوا رکھے ہیں۔

دوسرے روز جاوید نے پہلے اپنی ماں سے بات کی اور یہ بالکل نہ بتایا کہ نغمہ طوائف کی بیٹی ہے۔ اس کی ماں نے کچھ اعتراض کیا کیونکہ ان کا خیال اپنی برادری میں جاوید کی شادی کا تھا۔ لیکن جب اس نے کہا کہ وہ نغمہ سے محبت کرتا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور لڑکی سے شادی نہیں کرے گا تو ماں راضی ہو گئی۔ اس نے اپنے خاوند سے بات کی مجسٹریٹ احمد نے کہا۔

”تم نے لڑکی دیکھی ہے کیا؟“

بیگم نے کہا۔

”آج ہی تو اس نے بات کی ہے مجھ سے۔“

”پھر تم ان لوگوں کے ہاں جا کر ذرا ان سے مل آؤ اگر لڑکے کی مرضی وہاں

ہے تو ہم بیچ میں آنے والے کون ہیں۔“

بیگم کہنے لگیں۔

”یہ تو ٹھیک ہے مگر میرا ارادہ آپا احمد کی چھوٹی لڑکی فردوس سے جاوید کے بیاہ کا تھا۔“

مجسٹریٹ صاحب نے باپ کی راہ دکھاتے ہوئے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن زمانہ کونسا جا رہا ہے بیگم یہ بھی تو سوچو۔ آج کل

لڑکے لڑکیاں اپنی شادی آپ کرتے ہیں۔“



جاوید اگلیاں چٹخانے لگا۔ وہ اب اپنے باپ کو کیسے بتائے گا کہ انہیں کیوں بھجوا رہا ہے۔ اس نے کچھ اس طرح قائل کرنے کی کوشش کی۔

”بات یہ ہے کہ لڑکی کی والدہ کو آپ متاثر کر سکیں گے اور امی جان شاید ان پر اثر نہ ڈال سکیں اور اگر لڑکی کی ماں نے انکار کر دیا تو یہ میری زندگی کا سوال ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ پہلی بار آپ کو ان کے ہاں بھجواؤں تاکہ اگر معاملہ طے ہونا ہو تو پہلی ملاقات میں ہو جائے۔“

احمد صاحب جاوید سے بڑا پیار کرتے تھے۔ جب وہ معاملے کی یہ تک نہ پہنچ سکے تو ان پر اولاد کا پیار غالب آ گیا اور انہوں نے وہاں جانے کی حامی بھری۔ پھر مسکرا کر بولے۔

”لیکن برخوردار تم سوچ سمجھ کر وہاں شادی کر رہے ہو ناں۔ لڑکی کے بارے میں اچھی طرح تسلی کر لی ہے ناں تم نے؟“

جاوید نے ذرا شرما کر کہا۔

”جی ہاں۔ پوری تسلی کر لی ہے میں نے۔ میں پوری طرح سوچ سمجھ کر وہاں شادی کر رہا ہوں اور پوری ذمہ داری سے کر رہا ہوں۔“

”اس عمر میں آدمی سوچ سمجھ سکے تو اور کیا چاہیے بہر حال آدمی غلطیاں کر کے ہی سنبھلتا ہے۔ میں تمہارے فیصلے کا احترام کرتا ہوں اور ان لوگوں سے بات کروں گا۔ اگر وہ مان گئے تو شادی کر دوں گا۔ تم مجھے ان کے گھر کا ایڈریس دے دو۔“

جاوید نے ایڈریس لکھوایا اور سلام کر کے باہر آ گیا۔ وہ بڑا خوش تھا کہ اس کے باپ نے اس کا کہا مان لیا۔ اسے اپنے باپ سے بے حد عقیدت اور محبت پیدا ہو گئی تھی۔ اسے اسی فیصلہ یقین تھا کہ وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ اس نے خفیہ پامی کے ذریعے نقد کو

سے منع کر دیا۔ وہ وہاں پہلی بار اپنے باپ کو بھیجنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کی ماں وہاں گئی تو چھوٹی بائی صاف انکار کر دے گی۔ اگر اس کا باپ وہاں گیا تو چھوٹی بائی اس کے مرتبے کا خیال رکھتے ہوئے اگر اقرار نہیں کرے گی تو اتنی آسانی سے انکار بھی نہیں کر سکے گی۔ اس خیال کے ساتھ جاوید نے اپنے باپ سے براہ راست بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ شام کو جب اس کا باپ چائے پینے کے بعد اپنے کمرے میں آرام کرسی میں نیم دراز اخبار پڑھ رہا تھا جاوید نے وہاں جا کر بات شروع کر دی اس کے باپ نے اخبار پر سے رکھ دیا اور بولا۔

”تمہاری والدہ نے مجھ سے بات کی تھی۔ میں نے انہیں کہہ دیا ہے کہ وہ خود جا کر لڑکی سے بات کریں۔“

جاوید نے کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ آپ وہاں بہ نفس نفیس تشریف لے جائیں۔“

”بھئی میرے جانے سے کیا ہوگا۔ یہ کام تو عورتوں کا ہوتا ہے۔“

”میری خواہش ہے کہ آپ تشریف لے جائیں۔ مجھے ڈر ہے کہ لڑکی کی والدہ امی جان کی بات ٹال نہ دے۔“

”اور میری بات کو وہ نہیں ٹالے گی۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ ایسا نہ کر سکے گی۔“

احمد صاحب نے چشمہ اتار کر اسے رومال سے صاف کیا چشمہ لگایا۔ پاپ منہ میں دبایا اور اخبار پر نظریں گاڑ دیں۔ وہ اخبار مطلق نہیں پڑھ رہے تھے بلکہ جاوید کی خواہش کی تہ میں اترنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ ابھی تک نہیں سمجھ سکے تھے کہ ان کا بیٹا انہیں وہاں کیوں بھیجنا چاہتا ہے۔ انہوں نے کہا۔

”تم ابھی تک مجھے قائل نہیں کر سکے کہ مجھے وہاں کیوں جانا چاہیے۔“

اطلاع بھجوا دی کہ فلاں روز اپنے والد کو ان کے گھر بھجوا رہا ہے۔ نغمہ اس دن کا۔ یہ تابی سے انتظار کرنے لگی۔

ادھر سینٹھ نے شادی کے تقاضے شروع کر دیے۔ وہ نغمہ کو جلد سے جلد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے رسمی طور پر اپنی پہلی بے زبان بیوی کو کہہ دیا تھا کہ وہ دوسری شادی کر رہا ہے۔ کم سخن شریف عورت دل موس کر رہ گئی۔ وہ بھلا اسے کیا کہہ سکتی تھی۔ وہ اپنے خاوند کی عیاشیوں سے پوری طرح باخبر تھی۔ لیکن ایک مجبور پنچھی کی مانند اس کے پاس قید تھی۔ اس قید سے نکل کر کہیں جا بھی نہ سکتی تھی اور وہاں رہ کر خوش بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کا حال تو اس بلبل جیسا تھا جس نے قفس میں ہی آشیانہ بنالیا ہو۔

مجمو بائی اور پرویز بھی نغمہ کی سینٹھ سے جلد از جلد شادی کر دینا چاہتے تھے تاکہ انہیں فوری طور پر روپیہ، کار اور نئی کوٹھی کا قبضہ مل جائے۔ انہوں نے ایک بار پھر نغمہ سے پوچھے بغیر شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ نغمہ اس روز کے انتظار میں تھی جس روز جاوید کا باپ شادی کا پیغام لے کر اس کی ماں کے پاس آئے گا۔

آخر وہ دن بھی آ گیا۔ ایک روز تیسرے پہر نغمہ کی ماں مجمو بائی نغمہ کی شادی کے سوٹ صندوق میں تہہ کر کے رکھ رہی تھی کہ نوکر نے آ کر بتایا کہ کوئی صاحب باہر کھڑے ہیں۔ اپنے آپ کو مجسٹریٹ بتاتے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

”مجھ سے؟“ مجمو بائی نے حیرانی سے پوچھا۔

”جی کہہ رہے ہیں کہ بی بی نجمہ کی والدہ صاحبہ سے ملنا ہے۔“

مجمو بائی حیران ہی ہوئی۔ پھر سوچا کوئی تماش بین ہوگا۔ اس نے بے دلی سے نوکر سے کہا انہیں ڈرائیونگ روم میں بٹلاؤ اور خود کپڑے صندوق میں رکھنے میں مصروف ہو گئی۔

احمد صاحب کو ڈرائیونگ روم میں بٹلا دیا گیا۔ وہ کمرے کی زیبائش کو دیکھنے لگے۔

دیواروں پر قطعے لگے تھے۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔ کمرہ بڑے سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ ہر شے بڑے قرینے سے اپنی اپنی جگہ پر پڑی تھی۔ انہوں نے پائپ ساگایا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اسے پینے لگے۔ نغمہ کی ماں نے صندوق میں کپڑے رکھ کر ڈھکن بند کیا اور چہرہ تھوڑا تھوڑا پینٹ کر کے سر پر دوپٹہ اوڑھ کر ڈرائیونگ روم میں آ گئی۔ وہ احمد صاحب کے پشت والے دروازے سے کمرے میں داخل ہوئی۔

”فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتی ہوں آپ کی؟“

احمد صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے گھوم کے نغمہ کی والدہ کو دیکھا اور بولے۔

”معافی چاہتا ہوں۔ میں دراصل۔۔۔“

جب انہوں نے نغمہ کی ماں کے روپ میں اپنی سابقہ بیوی شمیم کو سامنے کھڑے دیکھا تو فقرہ ان کے حلق میں پھانسی بن کر اٹک گیا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے رہ گئے۔ مجمو بائی بھی بت بنی رہ گئی۔ دونوں میں سے کسی کو بھی یقین نہ تھا کہ وہ دس بارہ برس بعد زندگی کی سٹیج پر ایسے عالم میں پھر ملیں گے احمد اپنے لڑکے کے لئے اس کی لڑکی کا رشتہ مانگنے آئیں گے۔ احمد صاحب کے منہ سے صرف اتنا نکل سکا۔

”شمیم۔۔۔ تم؟“

شمیم عرف مجمو بھی صرف اتنا کہہ سکی۔

”اور آپ یہاں؟“

”ہاں میں۔۔۔ کیا نجمہ تمہاری بیٹی ہے۔“

”ہاں میری بیٹی ہے۔“

”کیا یہ میرے دوست علی آبر کی بیٹی ہے؟“

مجمو نے فوراً رخ بدل کر کہا۔



”کوئی بات نہیں“

احمد صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ جھمو نے انہیں بٹھلانے کی رسی کوشش کی مگر انہوں نے کام کا بہانہ بنایا اور سلام کر کے ایک نظر غور سے جھمو کو دیکھا۔

”شیم! وقت نے تمہارے ساتھ بڑا ظلم کیا۔ تم بوڑھی ہو گئی ہو۔“

جھمو نے آہستہ سے کہا

”اور تم بھی بوڑھے ہو گئے ہو۔“

احمد نے گہرا سانس لیا اور باہر نکل گئے۔ ایک ہل کے لئے جھمو پر گہری محویت کا عالم طاری رہا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑی کی کھڑی رہی۔ وہ پندرہ بیس برس پیچھے چلی گئی تھی۔ پھر اچانک اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا اور دروازہ بند کر دیا۔ جب وہ واپس دوسرے کمرے میں جانے لگی تو آئینے میں اپنے آپ پر ایک نگاہ ڈالی اور آہ بھر کر رہ گئی۔ وقت نے اس سے انتقام لیا تھا۔ اس نے اسے بوڑھا کر دیا تھا۔

”نہیں نہیں وہ تو نذر تھی نذر کو تو وہ تمہارے سامنے اسی دن اپنے ساتھ لے گیا تھا یہ تو بعد میں ہوئی تھی میں نے شادی کر لی تھی۔“

احمد صاحب کرسی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنا سر تھام لیا۔ ایک گہرا سانس لیا اور شیم کی طرف دیکھ کر بولے۔

”میں اپنے بیٹے جاوید کے لئے اس کا رشتہ مانگنے آیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ ان کی شادی کر دی جائے۔“

جھمو نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا جاوید آپ کا لڑکا ہے؟“

”ہاں کیوں؟“

”کچھ نہیں چائے نہیں گے یا کافی؟“

”کچھ نہیں پہلے میری بات کا جواب دو۔ میں یہاں اپنے بچے کے باپ کی حیثیت سے آیا ہوں۔ مجھے بتاؤ کیا تمہیں یہ رشتہ منظور ہے؟ میں اپنے بیٹے اور تمہاری بیٹی کی خوشنودی کے لئے چاہتا ہوں کہ ان کی شادی ہو جائے۔“

جھمو نے بڑی مکاری سے کہا۔

”مجھے افسوس ہے احمد کہ میں اپنی لڑکی کی ایک جگہ بات کہی کر چکی ہوں۔ اگر تم دو ایک روز پہلے آتے تو شاید میں انکار نہ کرتی۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔“

”میں مجبور ہوں“

نور بانگا کہ اب کیا کیا جائے۔ تم جو کہو گے میں اس پر عمل کروں گی۔ گھر میں اندر ہی اندر کچھ ریاں ہو رہی ہیں۔ میرا خیال ہے یہ لوگ اچانک میری کسی کے ساتھ زبردستی شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ بہر حال تمہیں ایک ایک پل کی خبر دیتی رہوں گی۔ تمہیں بہت بہت پیار! جاوید کا والد سر جھکائے اور گہری سوچ میں گم اندر داخل ہوا۔ جاوید بے تاب سے اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ احمد صاحب نے جاوید کو اور کچھ بتانا ضروری نہ سمجھا۔ صرف یہی بتایا کہ لڑکی کی ماں نے اس کی شادی کسی دوسری جگہ طے کر رکھی ہے۔ لہذا اس نے انکار کر دیا ہے۔ اور اب یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ جاوید کو بڑا صدمہ ہوا اس نے کہا۔

”یہ غلط ہے ابا جان نجمہ کی بات کہیں سنی نہیں ہوئی۔“

”جب اس کی ماں نے کہہ دیا تو اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں اسے کیسے جھٹا سکتا ہوں۔ اب تمہیں صبر کرنا چاہیے ارا ایک باغیرت مرد بن کر نجمہ کا خیال چھوڑ دینا چاہیے۔“

جاوید نے کوئی جواب نہ دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

احمد صاحب خود بھی نہیں چاہتے تھے کہ شیم کی لڑکی۔ ایک ہر جائی مزاج طوائف کی بیٹی ان کے گھر کی بہو بن کر آئے۔ اگر یہ لڑکی اس کے پیارے دوست علی اکبر کی بیٹی ہوتی تو وہ اسے بہو بنا کر لاتے اور اپنی خوش قسمتی سمجھتے۔ لیکن جانے یہ لڑکی کون تھی۔ اس کا باپ کون تھا۔ شیم کی بات کا انھیں کوئی اعتبار نہیں تھا۔ انہیں علی اکبر کا۔ اپنے پرانے دوست کا خیال آ گیا۔ اس سے ملے اسے دیکھے ایک زمانہ ہو گیا۔ جانے نیک دل انسان اپنی معصوم بچی نور کو لے کر کدھر نکل گیا تھا کہ پھر کبھی اس کی صورت ہی دکھائی نہیں دی۔ اب تو وہ بھی بڑا بوڑھا ہو گیا تھا۔ نور بیٹی بھی جوان ہو گئی ہوگی۔ خدا جانے یہ لوگ کہاں ہیں؟ احمد صاحب اس اور پریشان ہو گئے۔ ان کا ضمیر انہیں ملامت کرنے لگا۔ انہیں یوں لگا جیسے علی اکبر کے گھر کی تباہی اور بربادی کا وہی باعث

نور نے ساری باتیں سن لی تھیں۔

وہ جاوید کے باپ کو پوری طرح سے نہ دیکھ سکی تھی۔ وہ دروازے کی دراز کے ساتھ لگی تھی۔ دوسرے جاوید کے باپ کی اس کی طرف پیٹھ تھی۔ اسے اتنا ہی معلوم ہوسکا کہ جاوید کا باپ اور اس کی ماں ایک دوسرے کے پرانے واقف نکل آئے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ یہ بھی اس کی ماں نے جھوٹ بولا تھا کہ اس نے نور کی بات کسی اور جگہ سنی ہوئی ہے۔ اس کی بات تو کہیں بھی نہیں سنی ہوئی تھی۔ سینہ کے ساتھ اس نے شادی سے انکار کر دیا تھا اور کسی دوسری جگہ پر ابھی کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس کی ماں تو انکار کرنا چاہتی تھی۔ اور وہ اس نے کر دیا۔ نور کا دل چاہا کہ وہ دروازہ کھول کر اندر چلی جائے اور جاوید کے والد سے صاف صاف کہہ دے کہ اس کی ماں جھوٹ بول رہی ہے۔ اس کی کہیں بات سنی نہیں ہوئی۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔ اسے اپنی ماں پر سخت غصہ آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر گر پڑی۔ اور بے اختیار رونے لگی۔ چھو بانی نے نور سے جاوید کے باپ کی آمد کا کوئی ذکر نہ کیا اور سینہ سے اس کی بیاہ کی تیاریوں میں لگی رہی۔

نور نے اپنے خفیہ قاصد کے ذریعے فوراً ساری تفصیل جاوید کو لکھ کر بھیجی اور اس سے



کرنے والوں کو ایک بار پھر گھر سے بھاگ کر کسی دوسرے شہر میں جا کر شادی کرنا ہوگی۔ جاوید نے اس سلسلے میں تیاریاں شروع کر دیں۔ اس نے ادھر ادھر سے کچھ روپیہ اکٹھا کر لیا اور نغہ کی جانب سے اشارے کا انتظار کرنے لگا۔

ایک روز چھوٹی بائی نے نغہ کے آگے زری کا شاندار جوڑا اور زیوروں کا ڈبہ رکھتے ہوئے کہا۔

”جینی نہا کر انہیں پہن لو۔ آج شام ایک جگہ پارٹی پر جانا ہے۔“

نغہ کا دل نہیں چاہتا تھا مگر انکار نہ کر سکی۔ کیونکہ ماں کے لہجے میں بڑی محبت اور پیار تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کسی جگہ اسے دکھانے کے لئے جا رہے ہیں۔ لیکن اس نے سوائے جاوید کے ہر جگہ شادی سے انکار کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس نے غسل کیا۔ نیا جوڑا پہنا زیوارت پہنے اور بن سنور کر تیار ہو گئی۔ اس نے آئینے کے سامنے اپنا چہرہ دیکھا تو اپنے حسن اور شباب کا عالم دیکھ کر خود مسکرا ہو کر رہ گئی۔ کاش اس وقت اگر جاوید اسے دیکھ سکتا۔ وہ بے اختیار اس سے لپٹ جاتا اور پھر کبھی الگ نہ ہوتا۔ نغہ جاوید سے ہم آغوشی کے خیال پر شرمناک آئینے سے ہٹ گئی۔

”تیار ہو گئی بیٹی“

”جی ہاں“ نغہ نے رسمی سا جواب دیا اور چنگ پر بیٹھ گئی۔

”تو آؤ چلیں“

باہر گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اس میں پرویز بھی اگلی سیٹ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ نغہ کو یہ شخص زہر لگا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ گاڑی سینٹھ کی تھی۔ مگر نئی گاڑی تھی۔ نغہ نے پہچان سکی۔ اس کے علاوہ علی اکبر کی بجائے اسے دوسرا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ علی اکبر دوسری گاڑی لے کر کہیں گیا ہوا تھا۔

کار کو غمی سے باہر نکل کر کراچی کی شاہراہوں پر پوری رفتار سے بھاگنے لگی۔ کئی ایک

تھے۔ اور شاید حقیقت بھی یہی تھی۔ اگر وہ شمیم کی حوصلہ افزائی نہ کرتے تو علی اکبر اپنے گھر کو آگ نہ لگاتا۔ انہوں نے باپ کا کش لگایا۔ باپ بچھ گیا تھا۔ انہوں نے باپ میز پر رکھ دیا اور اٹھ کر کمرے میں ٹپٹنے لگے۔ پھر کانس کے ساتھ کہنی لگا کر کھڑے ہو گئے اور آتش ان میں رومی کاغذوں کو دیکھنے لگے۔ ان کا دل بھرا آیا۔ انہوں نے اپنا چہرہ دیوار کے ساتھ لگا دیا اور رو پڑے۔

اسی روز شام کو جاوید کو خفیہ قاصد کے ہاتھوں نغہ کا خط مل گیا۔ اس پر سارا راز کھل گیا۔ نغہ کے بیاہ کی خفیہ تیاریوں کی بڑی خبر نے اسے کسی قدر پریشان کر دیا۔ لیکن چونکہ نغہ نے ساتھ ہی لکھا تھا کہ وہ اسے حالات سے باخبر رکھے گی اس لئے اسے حوصلہ ہوا اور وہ ہر قسم کے بُرے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اس کا والد بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ وہ جو کچھ کر سکتا تھا کر چکا ہے اس سے آگے وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھائے گا۔ اب اسے اکیلا ہی حالات کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ پھر بھی اس نے احتیاطاً اپنے باپ سے پوچھ لیا کہ اگر وہ لڑکی سے سول میرج کرے تو کیا انہیں کوئی اعتراض ہوگا۔

احمد صاحب نے زندگی میں پہلی بار بیٹے کو غصے سے دیکھا۔

”ہو گا شدید اعتراض ہوگا۔ میں اس لڑکی کو بہو بنا کر گھر نہیں لانا چاہتا۔“

کیونکہ وہ ایک طوائف کی بیٹی ہے۔“

تو کیا انہیں معلوم ہو گیا؟ جاوید سنائے میں آ گیا۔ وہ اب اپنے باپ کو کچھ بھی نہ کہہ

سکتا تھا۔

”اگر تم نے اس لڑکی سے سول میرج کی تو میرے گھر کے دروازے تم پر

ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے۔“

جاوید نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر چنگ پر آنکھیں بند کر کے لیٹ

گیا اور آنے والے دنوں کے مصائب اور مشکلات پر غور کرنے لگا۔ ظاہر ہے اب ان دونوں محبت



میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ جتنا بھی پھڑ پھڑائے، دیواروں سے ٹکریں مارے، یہاں سے اسے رہائی نہیں مل سکتی۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ آنسو پی کر رہ گئی۔ اسے اس وقت اپنی ماں ایک خوف ناک ڈائن کے روپ میں دکھائی دی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر اس کا منہ نوچ لے۔ مگر ایسا نہ کر سکی۔ وہ کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ اسے پرویز سے کوئی گلہ نہ تھا۔ وہ تو غیر تھا۔ اسے تو نغمہ کی جوانی کا سودا کرنے کا پورا اہتمام تھا۔ لیکن اس کی ماں کو اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسے اپنی بچی کو دولت کی قربان گاہ پر بے زبان بکری کی طرح بھیٹ نہیں کرنا چاہیے تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی ماں اور پرویز وہاں سے چلے گئے۔ جاتے جاتے ماں نے اُسے الگ لے جا کر کہا کہ اگر اس نے وہاں سے پاؤں باہر نکالا تو وہ اسے کبھی چین نہ لینے دے گی۔ پرویز نے پھر اسے قتل کی دھمکی دی۔ بلکہ یہ بھی کہہ گیا کہ وہ سب سے پہلے جاوید کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ نغمہ ہم کر رہ گئی۔ دوسرے کمرے میں جا کر انہوں نے سینٹھ سے روپے لئے باہر کھڑی نئی کار اپنے قبضے میں کی اور نئی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئے۔

اب کمرے میں سینٹھ اور نغمہ اکیلے رہ گئے۔ سینٹھ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے پاس آیا اور صوفے پر ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ نغمہ ذرا پرے ہو گئی۔

”میری جان مجھ سے کب تک دور ہوگی۔ ابھی کیا میری قسمت میں اور بھی جدائی کے غم سہنے لکھے ہیں۔ میں تو پہلے ہی تمہاری محبت میں جل رہا ہوں۔

لو اب آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ۔“

نغمہ اٹھ کر دوسرے صوفے پر جا بیٹھی۔ سینٹھ جب اپنی اچکن سے باہر نکلی ہوئی تو نند پر ہاتھ پھیرتا وہاں بھی آنے لگا تو نغمہ نے کہا۔

”اگر آپ نے مجھے کچھ کیا تو میں خودکشی کر لوں گی۔“

سڑکوں پر سے گزر کر جب وہ ایک کوٹھی میں داخل ہوئی تو نغمہ نے محسوس کیا کہ اس کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ کوٹھی سینٹھ کی تھی اس نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ ماں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے ڈانٹا۔ پرویز نے پیچھے مڑ کر خون آلود نگاہوں سے نغمہ کو دیکھا۔ نغمہ بے بس ہو کر رہ گئی۔

کار پورج میں کھڑی ہو گئی۔ وہ تینوں اتر کر ایک کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ پرویز نغمہ کے پاس آیا اور جیب سے چاقو نکال کر اس نے کھولا اور اس کی نوک نغمہ کے گلے کے پاس لاکر بولا۔

”اگر تم نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی یا سینٹھ سے کسی قسم کی بدسلوکی کی تو یہ چاقو تمہیں بڑی آسانی سے ذبح کر سکتا ہے۔ میں کئی خون گر چکا ہوں۔ تمہارا خون کرنا میرے لئے کوئی بڑی بات نہ ہوگی۔ اگر تم نے ہمارے رنگ میں بھنگ ڈالی تو تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

اتنے میں کالا بھنگ سینٹھ ہنستا ہوا اندر داخل ہوا۔ پرویز نے چاقو بند کر کے جیب میں رکھ لیا اور مسکرا کر سینٹھ کو سلام کیا۔ سینٹھ نغمہ کا بھڑکیا لباس، زیور، زیبائش اور حسن دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ اور مبہوت ہو کر اور زیادہ بد صورت ہو گیا۔ مچھو لہک کر بولی۔

”سینٹھ صاحب آپ کی امانت آپ کے پاس آگئی اسے سنبھالنے گھر کی مالک بنائیے۔“

سینٹھ نے باچھیں کھول کر کہا۔

”مچھو بائی یہ تو میرے گھر میں مہارانی بن کر رہے گی میری ساری دولت اس کے قدموں میں ہوگی۔ تو میرے گھر، میری زندگی کے سیاہ سفید کی مالک ہوگی۔“

نغمہ کا سر پکڑنے لگا۔ وہ تو نئی طرح جال میں پھنس چکی تھی۔ اب تو اس کی بربادی



”اوہ! یہ منہ اور مسور کی وال“

سینٹھ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”تم واقعی بڑی بھولی ہو۔ تمہیں معلوم ہی نہیں کہ میں نے تمہیں کس قدر مضبوطی سے اپنے پنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ یہ میری کوٹھی نہیں بلکہ چتوڑ کا مضبوط ترین قلعہ ہے۔“

”اور میں رانی پدمنی ہوں۔ میں جلتی ہوئی آگ میں کود جاؤں گی مگر تمہارے پہلو میں نہیں بیٹھوں گی۔“

”یہ تمہارا وہم ہے نجمہ! آج سے تم میری ہو۔ تم میری ملکیت ہو۔ آج کی رات تم میری داشتہ ہو اور کل تم میری بیوی ہوگی۔ میں آج بھی تم سے نکاح کے دو بول پڑھوا سکتا تھا۔ مگر میں نے قصد ایسا نہیں کیا۔ میں طبعاً عیاش آدمی ہوں۔ میں بیوی کی نہیں بلکہ ایک نوجوان حسین اور کنواری داشتہ کی نفعی اتارنا چاہتا ہوں۔“

”کیوں اس بند کروڑ لیل انسان۔“

سینٹھ کو غصہ آ گیا۔ آخر مرد تھا اور دولت مند تھا۔ اپنی توجہ پر داشت نہ کر سکا۔ اس نے بڑے زور سے نعرہ کے منہ پر طمانچہ مار دیا۔ نعرہ صوفے پر گر پڑا۔ وہ زار و قطار رونے لگی سینٹھ نے الماری میں سے شراب نکال کر گلاس میں ڈالی اور اسے غناغٹ چڑھا کر اچکن اتار کر پرے پھینکی اور نعرہ کو بازوؤں میں جکڑ کر بولا۔

”تم میری لونڈی ہو۔ آج رات تم میری کنیز ہو۔ میری داشتہ ہو۔ دز خرید غلام ہو۔ میری ملکیت ہو۔ جس طرح یہ اچکن میری ہے۔ یہ پلنگ کی چادر میری ہے۔ تم بھی میرے پلنگ کی چادر ہو اور میں تمہیں چادر

”لیکن آخر کیوں؟ کس لئے کیا تم مجھ سے اتنی شدید نفرت کرتی ہو؟“

نعرہ نے نفرت سے کہا۔

”ہاں مجھے آپ سے شدید نفرت ہے۔ میں آپ کی صورت تک نہیں دیکھنا چاہتی۔“

سینٹھ کو قدرے غصہ آ گیا۔

”مگر میں نے تمہاری ماں کو تمہاری قیمت ادا کی ہے۔ میں نے اسے ہزاروں روپے دیئے ہیں۔ کار لے کر دی ہے۔ نئی کوٹھی بنوا کر دی ہے۔ میرا تم پر پورا پورا حق ہے۔“

نعرہ زپ کر بولی۔

”میں آپ کی منکوحہ نہیں ہوں۔ آپ مجھے اغوا کر کے یہاں لائے ہیں۔ میں اگر پولیس کو اطلاع کر دوں تو آپ گرفتار ہو سکتے ہیں۔“

سینٹھ نے ایک قہقہہ لگایا اور توند پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

”تم شاید نہیں جانتیں کہ اس کوٹھی میں اگر تم پورا ایک دن چپتی رہو تو کسی کانوں کا خبر نہیں ہو سکتی۔ باقی رہا شادی کا معاملہ تو وہ کل شام کو ہو جائے گا۔ میں نے بیاہ کی پوری تیاری کر رکھی ہے۔ تمہاری یہ شکایت بھی دور کر دی جائے گی اور بولو کیا چاہتی ہو؟“

”آپ اس کمرے سے نکل جائیں۔“

”ہا ہا! یہ تو ہم دونوں کا کمرہ ہے۔ دیکھتی نہیں ہو مسہری لگی ہے۔ بستر پر پھول پڑے ہیں یہاں ہم دونوں آرام کریں گے۔ میرا سر تمہارے زانوں پر ہو گا اور تم میرے بالوں میں اپنی نازک انگلیاں پھیر رہی ہوگی۔“

نعرہ نے حقارت سے کہا۔

جنگلی ریچھ کے ساتھ لگ کر سوئی رہے۔ مگر وہ راضی ہو گئی۔ اپنی عصمت لانے سے بہتر تھا کہ وہ ریچھ کے پاڑے میں گھس کر رات بسر کر دے۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ وہ رات بھر سینھ کے ساتھ پڑ کر لیٹی رہی۔ سینھ اسے پیار کرتا رہا۔ کبھی جسم پر ہاتھ پھیرتا کبھی منہ چومتا اور کبھی گالوں پر بوسے دیتا اس وقت نفاہنا سانس روک لیتی اور آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ چڑیا گھر میں کسی ریچھ کے پنجرے میں اس کے ساتھ بند ہو گئی ہے۔ وہ رات اس کے لئے قیامت کی رات سے کم نہیں تھی۔ جب صبح وہ اٹھی تو اسے یوں محسوس ہوا ہاتھ جیسے رات بھر کوئی اسے میلے پزے کی طرح ڈنڈے سے کوٹتا رہا ہو۔

سینھ نے خوب شراب پی لی تھی اور آدھی رات کے بعد مرے ہوئے سور کی طرح پڑ گیا تھا۔ پھر نفہ چنگ پر سے اٹھ کر صوفے پر چلی گئی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازوں، کھڑکیوں کا جائزہ بھی لیا۔ مگر ہر کھڑکی پر تالا لگا تھا اور ہر دروازہ باہر سے بالکل بند تھا۔ جب روشندان میں سے سورج کی ہلکی ہلکی روشنی کمرے میں آنے لگی تو نفہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے طوفان کی رات بسر کر لی تھی اور اس کا دامن بھی تر نہ ہوا تھا۔ اب اس کے سامنے سب سے اہم اور اولین کام یہ تھا کہ کسی طرح ڈرائیو علی اکبر سے مل کر جاوید کے گھر پیغام بھجوایا جائے اور اسے صورت حال سے آگاہ کیا جائے۔ سینھ چنگ پر بے سدھ ہو کر سو رہا تھا اور بڑے خوف ناک انداز میں خرانے لے رہا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ اٹھا۔ اس نے مسکرا کر نفہ کو دیکھا۔ نفہ مصنوعی انداز میں مسکرائی۔ سینھ کی باجیس کھل گئیں۔ اٹھ کر نفہ کو ساتھ لگا لیا اور منہ چومنے لگا۔ نفہ نے سانس روک لیا۔ اس نے گھنٹی دی۔ خادمہ باہر سے دروازہ کھول کر ناشتے کی ڈرائی لے کر اندر آ گئی۔

نفہ نے سینھ کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ اس کے بعد سینھ اپنے کام پر نکل گیا۔ نفہ اکیلی رہ گئی۔ وہ باہر برآمدے میں آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ گیٹ پر چوکیدار پہرہ دے رہا تھا۔ وہ وہاں سے ایک منٹ کے لئے بھی باہر نہ جاسکتی تھی۔ اب وہ اس بات کی فکر میں تھی کہ کہیں سے علی اکبر نظر

سمجھ کر ہی استعمال کروں گا۔ تم مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتیں۔ اس کمرے کے تمام دروازے بند ہیں۔ دیواریں آواز کو جذب کرتی ہیں۔ یہ کمرہ پندرہ بیس کمرے کے بیچ میں واقع ہے۔ یہاں ہماری فریاد کوئی نہیں سن سکتا۔ بہتر یہی ہے کہ اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو۔ میرے سپرد کر دو۔ گرم گرم پالتو بلی کی طرح اچک کر میری آغوش میں آ کر میرے سینے سے لگ جاؤ۔“

سینھ نے نفہ سے ہاتھ پائی شروع کر دی۔ نفہ پریشان ہو گئی۔ ہر اسان ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ واقعی مجبور اور بے بس ہے۔ وہ تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ اب اس نے دوسری طرح کام نکالنے کی کوشش کی۔ اس نے بڑی منت سے کہا۔

”خدا کے لئے مجھے آج کچھ نہ کہو۔ بیمار ہوں۔ بہت بیمار ہوں۔ کل جب میں تمہاری بیوی بن جاؤں گی تو مجھے صحت بھی مل جائے گی۔ پھر میں کچھ نہ کہوں گی۔“

سینھ نے جب دیکھا کہ نفہ راہ راست پر آ گئی ہے تو وہ بھی ٹھٹھک گیا۔ نفہ کی طرف غور سے دیکھ کر بولا۔

”کیا واقعی تم بیمار ہو مجھ؟“

”سچ کہتی ہوں بہت بیمار ہوں۔ تم کو میری آنکھوں کے گرد حلقے نہیں نظر آ رہے؟“

”بہت اچھا لیکن ایک شرط پر تمہاری بات مانوں گا کہ تم رات بھر میرے ساتھ لگ کر لیٹی رہو۔“

نفہ کے لئے یہ بڑا کٹھن امتحان تھا۔ سینھ کے ساتھ لگ کر سونا ایسے تھا جسے کوئی ہر نی



سے گلے لگ کر ملی۔ نفعہ قدرے سرومہری سے پیش آئی۔ مگر اس نے ذرا سا بھی اشارہ نہ دیا کہ وہ سینٹھ سے ناراض ہے۔

”خدا کرے کہ تم سدا سکھی رہو میری بیٹی! بس اتنی سی بات تھی جس کے لئے تم نے اتنا طوفان کھڑا کر دکھا تھا۔ وہ جاوید تمہیں کیا دے سکتا تھا بھلا۔ یہاں تم ساری زندگی عیش کرو گی۔ دولت اور سکھ میں کھیلو گی۔ آزاد مہارانیوں کی طرح اس گھر پر حکومت کرو گی۔ پہلی بیوی تو نہ ہونے کے برابر ہے اور سینٹھ نے کہہ دیا ہے کہ اب وہ زیادہ عرصہ اپنے ماموں کے پاس رہا کرے گی۔ سینٹھ اسے وہیں خرچ بھیج دیا کرے گا۔“

پرویز نے بھی نفعہ کی دلجوئی کرنے کی کوشش کی لیکن نفعہ نے اسے منہ نہ لگایا۔ دو پہر کا کھانا ان سکھوں نے مل کر کھایا۔ اس کے بعد نفعہ کیا دیکھتی ہے کہ ایک سفید ریش مولوی صاحب اندر تشریف لائے اور السلام و علیکم کہہ کر صوفے پر براجمان ہو گئے۔

”سینٹھ صاحب اجازت ہے“

”جی بسم اللہ کیجئے“

مولوی صاحب نے دو نکاح نامے اپنے تھیلے میں سے نکالے اور ان کی خانہ پری شروع کر دی۔ نفعہ کا رنگ فق ہو گیا۔ یہ لوگ تو سینٹھ سے اس کا نکاح پڑھ رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ پر پتھر بن کر بیٹھی رہی۔ مگر اب کچھ نہ کر سکتی تھی۔ مولوی صاحب نے خانہ پری کے بعد کچھ آیات پڑھیں۔ سینٹھ سے ایجاب قبول کروایا اور پہلے اپنے اور لڑکی کی ماں اور پرویز کے دستخط کئے پھر سینٹھ کے دستخط کروائے۔ آخر میں نفعہ کی طرف نکاح نامہ بڑھا کر بولا۔

”بیٹی یہاں دستخط کر دو“

نفعہ قلم ہاتھ میں لے کر ایک لمبے کے لئے بت بن کر نکاح نامے کو کھینچی رہی۔ پرویز اور

آجائے۔ لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دے رہا تھا۔ آخر اس نے نوکرانی سے پوچھ ہی لیا کہ علی اکبر ڈرائیور کہاں ہے؟ نوکرانی سے کہا۔

”جی وہ تو سینٹھ صاحب کے بچوں کو چھوڑنے حیدر آباد گیا ہوا ہے۔“

”کب آئے گا۔“

”جی شام کو آجائے گا۔“

نفعہ کا رنگ اڑ گیا۔ تو کیا آج کا دن اتنا قیمتی دن ضائع چلا جائے گا۔ رات اسے نہنگ کی طرح منہ پھاڑے دکھائی دی۔ وہ بے چین سی ہو کر انٹھی اور برآمدے میں ٹہلنے لگی۔ اچانک اسے جاوید کے فون نمبر کا خیال آ گیا۔ ٹھیک ہے وہ اسے فون کر سکتی ہے اس خیال کے ساتھ ہی اس نے نوکرانی سے پوچھا۔

”یہاں ٹیلیفون کس کمرے میں ہے؟“

”جی سینٹھ صاحب کے خاص کمرے میں ہے۔“

”وہ کمرہ کہاں ہے؟“

”جی سامنے ہی ہے مگر وہاں تو تالا لگا ہے۔“

”چابی کس کے پاس ہے؟“

”جی صبح سینٹھ صاحب تالا لگا کر چابی ساتھ ہی لے گئے تھے۔“

نفعہ کی رہی سہی امید پر بھی پانی پھر گیا۔ اس کے سارے پروگرام خاک میں مل گئے۔ اگر علی اکبر شام تک نہ آیا تو معاملہ بڑی نازک صورت اختیار کر جائے گا۔ کیونکہ آج شام سینٹھ اس سے ضرور نکاح پڑھوائے گا۔ نفعہ کو چکر سا آ گیا۔ وہ آرام سے کرسی کے ساتھ سر لگا کر نیم دراز ہو گئی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دو پہر کو سینٹھ نفعہ کی ماں اور پرویز کے ساتھ کونٹھی میں داخل ہوا۔ اس کی ماں نے منٹائیوں اور پھلوں کے ڈبے اٹھا رکھے تھے۔ وہ آتے ہی مکار عورتوں کی طرح نفعہ

”اب ہوشیاری سے اس گھر میں رہنا۔ یہ گھر سونے چاندی سے بھرا ہوا ہے۔ اسے علی بابا کی غار سمجھو میں تمہیں ہر روز آ کر ملتی رہوں گی۔ پھر اکٹھے مل کر ایک پروگرام بنائیں گی اور اس پر باقاعدہ عمل کیا جائے گا۔ اب میں جاتی ہوں۔“

نفر کی ماں اور پرویز سینھ کے ساتھ کار میں بیٹھ کر کوفی سے باہر نکل گئے۔ جانے وہ کس چکر میں تھے اور کہاں جا رہے تھے۔ نفرا کیلے رہ گئی تو اس نے فوراً علی اکبر کا معلوم کیا۔ نوکرانی نے بتایا کہ علی اکبر آگیا ہے اور ابھی ابھی اپنے کوارٹر میں گیا ہے۔ نفرا کو جیسے پھر سے نئی زندگی مل گئی۔ اس نے نوکرانی سے کہا۔

”اے بلا لاؤ۔ ابھی اسی وقت کہو بی بی جی نے بلایا ہے۔“

”اچھا بی بی جی۔“

نوکرانی علی اکبر کو بلا نے چلی گئی۔ نفرا کوفی کے عقبی برآمدے میں آ کر بیٹھ گئی۔ کوئی دس منٹ بعد علی اکبر آ گیا۔ سفید بالوں والا نیک دل بڑھا باپ اپنی حقیقی بیٹی کو وہاں دیکھ کر حیران ہوا۔ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ نفرا سے اشارے سے اندر بٹلا کر لے گئی۔ اندر جا کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور روتے ہوئے بڑھے کے کندھے پر سر رکھ دیا۔

”بابا! میرے ساتھ ظلم ہو گیا۔ میں برباد ہو گئی۔ میری ماں نے میرا سینھ سے زبردستی نکاح پڑھا دیا ہے۔ خدا کے لئے جاوید کی کوٹھی جاؤ اور اسے صورت حال سے باخبر کر دو۔“

”گھبراؤ نہیں بیٹی! میں تمہارے لئے اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔ تم مجھے جاوید کے گھر کا پتہ دو۔ میں ابھی وہاں جا کر اسے ساری بات بتاتا ہوں۔ پھر وہ جس طرح کہے گا ویسے ہی ہوگا۔ اپنی بچی کے لئے علی اکبر کی

مجمو بائی نے آگے بڑھ کر کہا۔

”کیا سوچ رہی ہو بیٹی۔ دستخط کر دو ناں۔ اب تو تم اس گھر کی بادشاہ زادی بن گئی ہو۔ مبارک ہو سینھ صاحب۔“

”مبارک ہو مبارک ہو۔“

پرویز نے دیکھا کہ نفرا چٹکپٹا رہی ہے تو اس کے پاس آ کر اس کے کان میں وہی قتل والی دھمکی دہرائی۔ نفرا نے دستخط کر دیئے اور پھر چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر مٹھوٹ مٹھوٹ کر رونے لگی۔

”میری جان! میری بنو! رو نہیں۔“

”مجمو بائی نے بیٹی کو گلے سے لگا کر کہا۔ پرویز نے سینھ کے سگریٹ کیس سے بیش قیمت سگریٹ نکال کر سگاتے ہوئے کہا۔

”بھئی ایسے موقعوں پر سبھی لڑکیاں روتی ہیں۔ تم دلہن سے اس کا حق نہ چھینو۔“

نفرا وہاں سے بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اب وہ سینھ کی باقاعدہ منکوحہ بیوی بن گئی تھی۔ اب سینھ کو اس پر پورا پورا حق تھا سینھ نے کمرے میں آ کر اس کی گردن پر بوسہ دیا اور جیب سے ایک انتہائی قیمتی انگوٹھی نکال کر اسے پہنا دی۔

”یہ میری محبت کا حقیر تحفہ ہے نجمہ۔ اب تم میری بیوی ہو۔ میری زندگی اور میری خوشیاں تمہارے قدموں میں ہیں۔ آج رات امید ہے تم تیار نہیں ہوگی۔ تم نے کل وعدہ کیا تھا ناں۔۔۔ ہے ناں میری جان! آج تمہاری سہاگ رات ہوگی۔ اور یہ رات زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے۔“

اتنا کہہ کر سینھ چلا گیا۔ پھر اس کی ماں اندر آئی اور بیٹی کی بلائیں لے کر بولی۔



علی اکبر کو جاوید کی کوٹھی تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہ ہوئی۔ اس نے گاڑی کوٹھی کے پورچ میں کھڑی کی اور نوکر سے جاوید کا پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ باہر گئے ہیں ابھی آ جائیں گے۔ علی اکبر گاڑی میں بیٹھا رہا اور گاڑی پورچ میں کھڑی رہی۔

بمشکل اسے دس پندرہ منٹ وہاں گزرے ہوں گے کہ مجسٹریٹ احمد یعنی جاوید کے والد اور علی اکبر کے قدیمی دوست کی گاڑی کوٹھی میں داخل ہوئی۔ مجسٹریٹ نے جب پورچ میں ایک گاڑی کھڑی دیکھی تو خیال آیا کہ کوئی مہمان آیا ہے۔ لیکن یہ گاڑی پورچ میں کیوں کھڑی ہے۔ انہوں نے ہارن دیا اور شیشے میں سے دیکھا کہ ایک بوڑھا ڈرائیور وہیل پر بیٹھا تھا۔ علی اکبر نے جب ہارن کی آواز سنی تو انجن سٹارٹ کر کے گاڑی آگے کر دی۔ مجسٹریٹ صاحب نے اپنی گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ جس وقت وہ باہر نکلے تو انہوں نے نوکر سے پوچھا۔

”اندرون صاحب آئے ہیں؟“

”نوکر نے بتایا۔“

”کوئی نہیں صاحب“

جان بھی حاضر ہے۔“

اس آخری جملے نے نغہ کے سینے میں بھی تلاطم سا برپا کر دیا۔ آج تک کسی نے اسے بیٹی کہہ کر نہیں پکارا تھا۔ اس کے علاوہ علی اکبر نے جب بھی اسے بیٹی کہا نغہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا حقیقی باپ اس کے سامنے کھڑا ہے۔ اب ان دونوں کو کیا معلوم کہ وہ ایک دوسرے کے حقیقی باپ بیٹی ہیں!

”لیکن بابا چوکس رہتا۔ یہاں میری بڑی سخت نگرانی کی جا رہی ہے۔ اگر

کسی کو ذرا بھی معلوم ہو گیا کہ تم نے تنہائی میں مجھ سے گفتگو کی تو مصیبت آ جائے گی۔“

”فکر نہ کرو بیٹی! یہاں تمہارا کوئی بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔ جب تک میں زندہ ہوں تمہاری طرف کوئی تیزمی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔“

نغہ کے دل و دماغ سے جیسے ایک نیا پر جوش خون گردش کرنے لگا۔ علی اکبر کی پدرانہ

’شفقت اور دلیری کی باتوں نے نغہ کی ساری ناامیدی کی دنیا کو بدل دیا تھا۔ علی اکبر گاڑی لے کر جاوید کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور نغہ اس کی واپسی کا بے تابی سے انتظار کرنے لگی۔

جب آپ بھی پلٹ کر واپس نہیں آ سکتے تھے۔ کوٹھی کے سارے نوکر حیران ہو کر دیکھ رہے تھے کہ مجسٹریٹ صاحب ایک معمولی ذرا نیور کے گلے لگ کر بچوں کی طرح رو رہے ہیں۔

”میرے دوست علی اکبر! تم اتنی مدت کہاں رہے؟ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اے رب العالمین! مرنے سے پہلے مجھے اپنے دوست سے ضرور ملا دینا۔ تاکہ میں اس سے اپنے گناہ کی معافی مانگ لوں۔ نہیں تو میری روح کو جہنم نصیب نہیں ہوگا۔

علی اکبر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”زمانے کی گردشیں اڑائے لئے پھرتی ہیں احمد بچی! تم جو گئی اکیلا رہ گیا۔ نوکریاں کی در بدری کی۔۔۔“

”نغمہ گم ہو گئی؟“ احمد نے آنسو پونچھ کر پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ وہ تو چھ برس کی تھی کہ گم ہو گئی۔ بس یہ سمجھ کر جس روز میں گھر سے نکلا ہوں اس کے ٹھیک ایک سال بعد گم ہو گئی۔“

”آؤ اندر چل کر باتیں کرتے ہیں۔“

احمد اپنے دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھے بڑی محبت سے اسے کوٹھی کے اندر لے گیا۔ اس نے چائے منگوائی اور پرانی یادوں کو پھر سے تازہ کرنے لگے۔ احمد نے سب سے پہلے ایک بار پھر علی اکبر سے اپنے گناہ عظیم کی مافی مانگی۔ علی اکبر نے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں احمد۔ ہر انسان میں کمزوریاں ہوتی ہیں۔ جو ہو چکا

اس کی بات نہ کرو۔ اب یہ بتاؤ کہ کیا جاوید تمہارا بیٹا ہے؟“

”ہاں ہاں۔۔۔ بات کیا ہے؟ تم اس کی تلاش میں کیوں پھر رہے ہو؟“

علی اکبر نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر اپنے دوست احمد کو ساری بات تفصیل سے

بتادی کہ کس طرح وہ سیٹھ کے ہاں بطور ڈرائیور کے ملازم ہوا اور کیسے ایک روز ہوائی اڈے کی

”پھر گاڑی کسی کی کھڑی ہے؟“

”جی یہ بوڑھا ڈرائیور جاوید صاحب سے ملنے آیا ہے۔“

مجسٹریٹ صاحب کو اپنے بیٹے کی پریشان کن سرگرمیوں کا علم تھا۔ وہ ان باتوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے غصے میں گاڑی کی طرف دیکھا اور اس خیال سے علی اکبر کی طرف آئے کہ ذرا وہ ڈرائیور کی طبیعت صاف کریں کہ وہ اس کے بیٹے سے کیوں ملنے آیا ہے۔ اس کو کس نے بھیجا ہے؟ گاڑی کے پاس آ کر احمد صاحب نے اندر جھانک کر دیکھا اور ڈرائیور کو باہر بلا یا۔ ایک نظر میں دونوں دوست ایک دوسرے کو نہ پہچان سکے۔ علی اکبر فوراً باہر آ گیا اور سلام کر کے بولا۔

”جناب مجھے جاوید صاحب سے ملنا تھا اور میں۔۔۔“

دونوں نے غور سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پندرہ برس کے پندرہ دین پر دے ایک ایک کر کے اٹھنے لگے۔ ماضی کی بوسیدہ کتاب کے پندرہ ورق ایک ایک کر کے اٹھنے لگے۔ آخر دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اگرچہ وقت نے دونوں کے حلیے بدل کر رکھ دیئے تھے۔ دونوں بوڑھے ہو گئے تھے۔ دونوں کے بال سفید ہو گئے تھے۔ چہروں پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ بدن لاغر اور نحیف ہو گئے تھے۔ مگر دوستی کا رشتہ باقی تھا۔ دیا و خدا لا ہو گیا تھا۔ مگر روشنی کی ہلکی سی کرن باقی تھی۔

”تم۔۔۔ تم علی اکبر ہوتا؟“

”اور۔۔۔ تم۔۔۔ تم احمد ہوتا؟“

”ہاں۔۔۔ ہاں میرے پیارے دوست۔۔۔“

اور دونوں لپک کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ان خوبصورت یادوں کو رونے لگے جو گذر گئی تھیں۔ ان سین لہجوں کو رونے لگے



طرف جاتے ہوئے اس کی جاوید اور نجمہ سے ملاقات ہوئی پھر اس نے ان دونوں کو پناہ دی۔ پھر کیسے سینہ کے ساتھ نجمہ کی زیر ہستی شادی کر دی گئی اور اب کیا صورت حال ہے!

احمد نے غور و فکر کے انداز میں آنکھیں کھلی لیں۔ پھر علی اکبر کی طرف دیکھ کر بولا۔  
”تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی علی اکبر کہ نجمہ تمہاری سابقہ بیوی شیم کی بیٹی ہے۔“

”کیا؟ کیا کہا؟ نجمہ بیٹی شیم کی بیٹی ہے؟“  
”ہاں۔“

اور پھر مجسٹریٹ احمد نے علی اکبر کو بتایا کہ وہ کس طرح اپنے بیٹے کے کہنے پر اس کے ہاں شادی کا پیغام لے کر گیا اور پھر کیسے اس نے دیکھا کہ سامنے شیم کھڑی تھی۔

”میں تو اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے پوچھا کہ یہ لڑکی نجمہ کہیں میرے پیارے دوست کی بیٹی تو نہیں؟“

”پھر کیا کہا اس نے؟“ علی اکبر نے جلدی سے پوچھا۔

”اس نے کہا نہیں یہ تو میں نے بعد میں شادی کر لی تھی تو پیدا ہوئی نفد کو تو اس کا باپ تمہارے سامنے ساتھ لے گیا تھا۔“

علی اکبر نے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔

”احمد! وہ کواں کرتی ہے ذلیل عورت! نجمہ میری بیٹی نفد ہی ہے۔ میں بھی

کہتا تھا کہ اس کی آواز سن کر مجھے نفد بیٹی کی آواز کیوں یاد آتی ہے۔ میرا

دل اسے دیکھ کر اسے پیار کرنے کو کیوں بیتاب ہو جاتا ہے۔ احمد! وہ میری

گمشدہ بیٹی نفد ہے۔ میری بیٹی مجھے واپس مل گئی۔ میری بیٹی خدا نے مجھے

واپس کر دی۔“

علی اکبر چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر ہلکے ہلکے گرو گرو لگا۔ احمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سر ہکا دیا۔ اس کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں۔

”تمہیں خوش ہونا چاہیے علی اکبر کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری بیٹی تمہیں ملا دی۔

اب میں بڑے فخر کے ساتھ اپنے بچے کی شادی نفد سے کروں گا۔ دھوم

دھام سے شادی ہوگی۔ میں نے تو شیم سے اسی روز کہہ دیا تھا کہ اگر یہ

نجمہ میرے دوست کی بیٹی ہے تو اس کے ساتھ اپنے بیٹے کو بیاہ کر میں فخر

محسوس کروں گا۔“

علی اکبر نے سر آہ بھر کر کہا۔

”لیکن اب کیا ہو سکتا ہے سینہ نے نفد سے نکاح کر لیا ہے۔ وہ اس کی

منکوہ بیوی ہو چکی ہے۔“

”ہم لڑکی سے طلاق دلوا دیں گے۔“

”آپ ان لوگوں کو نہیں جانتے وہ بد معاش لوگ ہیں آپ انہیں جیل میں

بھی ڈال دیں گے تو ان کے ساتھی اس کا بدلہ آپ کے بچوں سے لیں

گے۔ اب سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہیں۔“

اتنے میں باہر سے جاوید کی آواز سنائی دی۔ احمد صاحب نے اسے اندر بلوایا۔ جاوید

نے جب علی اکبر ڈرائیور کو اپنے باپ کے سامنے بیٹھے دیکھا تو لرز گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ بھانڈا پھوٹ

گیا ہے اور ابا جان نے علی اکبر کو پکڑ کر وہاں بٹھالیا ہے۔ جب وہ اندر آ کر ڈرتے ڈرتے کھڑا ہوا

تو مجسٹریٹ صاحب نے مسکرا کر کہا۔

”جاوید! ان سے ملو۔ انہیں جانتے ہو؟“

جاوید نے سوچا کہ جھوٹ بولنے سے بات اور گہڑ جائے لی اس لیے جی ہی بولنا قرین

”پھر ملوں گا احمد! ابھی باپ کو اپنا فرض پورا کر لینے دو۔۔۔ آؤ جاویز۔“

علی اکبر جاوید کو لے کر سینھ کی کونھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس نے جاوید کو بتایا کہ نغہ سے سینھ نے دھوکے سے شادی کر لی ہے۔ نکاح نامہ لکھا گیا ہے اور اب وہ اس کو منکوحہ بیوی ہے۔

”یہ تو بڑا غضب ہو گیا۔ اب کیا ہو سکتا ہے چچا جان؟“

”گھبراؤ نہیں بیٹا! میں اپنی بچی اور تمہارے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگا دوں گا۔ نغہ کی شادی تم سے ضرور ہوگی۔ خواہ اس کے لئے مجھے کوہ ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں کو ہی ریزہ ریزہ کیوں نہ کرنا پڑے۔“

علی اکبر نے جاوید کو اپنے کوارٹر میں چھوڑا اور خود گاڑی لے کر سینھ کی کونھی میں آ گیا۔ نغہ برآمدے میں بے چینی سے ٹپکتی ہوئی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

علی اکبر کو دیکھ کر اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ علی اکبر گاڑی کا دروازہ کھول کر نغہ کی طرف بڑھا۔ اب وہ سینھ کا ڈرائیور نہیں تھا بلکہ ایک خوش نصیب باپ تھا کہ پندرہ برس کے بعد اپنی گمشدہ بچی کو گھلے سے لگانے جا رہا تھا۔ علی اکبر نے نغہ کو دیکھا۔ وہ بالکل اس کی بچی تھی۔ اب ہر نقش نمایاں ہو کر اس کی بچی کی نشان دہی اور تصدیق کر رہا تھا۔ علی اکبر کیوں معلوم ہوا جیسے منہ سی نغہ پانی سے بھرا ہوا ڈبہ لئے تل کے پاس اپنے باپ کا انتظار کر رہی ہے۔

”آگئے بابا؟“ اندر آ جاؤ۔

علی اکبر اندر کمرے میں چلا گیا۔ اب وہ ٹپکتی باند کر نغہ کو نکلے جا رہا تھا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا ”میری بچی“

میری بیٹی میری بچی۔۔۔ نغہ نے حیرانی سے پوچھا۔

”بابا تم بولتے کیوں نہیں کیا جاوید نہیں ملا!“

مصلحت ہے۔ اس نے کہا۔

”جی ہاں سینھ صاحب کے ڈرائیور علی اکبر ہیں۔ لیکن ابا جان اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔“

”خاموش رہو اور غور سے سنو!۔۔۔ یہ علی اکبر میرے بڑے بھائی اور عزیز ترین دوست ہیں اور تمہارے چچا ہیں اور تمہاری ہونے والی بیوی نغہ کے حقیقی باپ ہیں۔“

جاوید چکر کھا کر رہ گیا۔ ایک دم کچھ ایسے خیرت انگیز رازوں پر سے پردہ اٹھا تھا کہ اس کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ وہ ایک دم صوفے پر بیٹھ گیا۔

اس کے والد صاحب نے پوری تفصیل سے جاوید کو ساری بات ذہن نشین کر دی۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

”ٹھیک ہے ابا جان نغہ کا اصلی نام نغہ ہی ہوگا۔ کیونکہ ایک روز میں نے اس کی کاپی پر کئی جگہوں پر نغہ نغہ لکھا دیکھا تھا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کس کا نام ہے تو اس نے آہ بھر کر کہا تھا۔ میری ایک سہیلی ہوا کرتی تھی بے چاری مر گئی۔“

علی اکبر فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”دوست احمد اب مجھ میں بے تاب انتظار نہیں۔ میں بہت جلد اپنی پیاری بچی کو جا کر سینے سے لگانا چاہتا ہوں اور تم بھی میرے ساتھ چلو وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔“

احمد نے علی اکبر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”میرے دوست تم نے مجھے خدمت کا موقع ہی نہ دیا۔“



”میں! اللہ نے میری بچی مجھے ملا دی۔ یہ رونے کا نہیں خوشی کا وقت ہے۔“

اب مجھے بتاؤ کہ میں تمہاری خاطر کیا کر سکتا ہوں۔“

اب نغمہ کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ اس کی آنکھیں نیچی تھیں اور وہ محض رورہی تھی۔

علی اکبر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”دو ٹیمیں میری بیٹی! جاوید کو میں نے بلوایا ہے۔“

نغمہ نے فوراً پوچھا۔

”کہاں ہے وہ بابا؟“

”میرے کوارٹر میں ہے۔ اب میں جاتا ہوں۔ تم رات ہونے سے پہلے

پہلے کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل کر میرے کوارٹر میں پہنچ جاؤ۔ میں

یہاں سے تم دونوں کے فرار کے انتظامات کرنے جا رہا ہوں۔ تم کوارٹر

میں پہنچ جاؤ۔ جاوید وہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ اب میں جاتا ہوں۔“

اتنا کہہ کر علی اکبر باہر نکل گیا اور نغمہ اکیلی پٹنگ پر بیٹھ کر واقعات کی حیرت انگیز تبدیلیوں

پر غور کرنے لگی۔ وقت نے چند دنوں میں اتنی تیزی سے کروٹ لی تھی کہ اس کا دماغ اس کا متحمل

نہیں ہو رہا تھا۔ اسے اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ اسے اپنا پیارا چھڑا ہوا باپ مل گیا ہے اور یہ کہ

جاوید اس کے باپ کے جگر کی دوست احمد صاحب کا بیٹا ہے اور یہ کہ احمد صاحب بھی نغمہ کی شادی

اپنے بیٹے سے کر کے فخر محسوس کریں گے۔ اب مصیبت یہ تھی کہ وہ سینہ کے چنگل میں بڑی طرح

پھنس چکی تھی۔

بہر حال اس نے اس جال سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کیونکہ اسے اپنے سامنے باہر

آزادی کی پُر قضا ادویاں نظر آ گئی تھیں۔ شام ہو رہی تھی۔ مشرق کی طرف سورج ہو گیا تھا اور

سڑکوں پر بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ نغمہ کو اس خیال سے زیادہ بتیابی ہو رہی تھی کہ جاوید علی اکبر کے

”میری بچی مجھے مل گئی ہے بیٹی۔“

”کون سی بچی بابا؟ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”بابا تم بولتے کیوں نہیں کیا جاوید نہیں ملا؟“

”میری بچی مجھے مل گئی ہے بیٹی۔“

”کون سی بچی بابا؟ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”میری نغمہ مجھے مل گئی ہے بیٹی! میری نغمہ جو مجھ سے پندرہ برس پہلے چھڑ گئی

تھی۔ میری نغمہ جس کی ماں شمیم کو طلاق دینے کے بعد میں اسے ساتھ لے

کر کرچی آ گیا تھا اور جسے اس کی ماں کے آدمی اس طوائف زادی کے

دلال پھر سے اغوا کر کے لے گئے۔ تم میری بیٹی ہو نغمہ! میں تمہارا بوز حیا

باپ ہوں۔“

نغمہ نے جب اپنا اصلی نام علی اکبر کی زبان سے سنا اور دوسری باتیں سنیں تو اس کا دل

بڑی طرح دھڑکنے لگا۔ اسے کچھ یاد آنے لگا کہ وہ روٹی لے کر اپنے باپ کے پاس کارخانے جایا

کرتی تھی اور ایک روز وہ مل پر پانی لینے گئی تھی کہ کسی نے اس کے اوپر کھل ڈال دیا اور اسے اٹھا کر

لے گیا۔ پھر اس نے اپنی ماں کو دیکھا اسے پیار کر رہی تھی اور باپ کے خلاف بھڑکار رہی تھی۔ اب

اسے بھی محسوس ہوا کہ علی اکبر کو اپنے سامنے دیکھ کر پہلی بار اس کے اندر باپ کی محبت نے کیوں

جوش مارا تھا اور وہ کیوں اس کے منہ سے بار بار بیٹی ایسا پاکیزہ لفظ سننا چاہتی تھی۔

آسمان صاف ہو گیا تھا۔ بادل بھاگ گئے تھے۔ ہر شے اپنی جگہ پر دھوپ کی روشنی میں

بالکل نمایاں روشن اور صاف ستھری دکھائی دینے لگی تھی۔ نغمہ ”ابا جان“ کہہ کر اپنے بڑے باپ

سے لپٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے فرط محبت میں آنسو جاری ہو گئے۔ علی اکبر نے جی بھر کر اپنی بیٹی

کو پیار کیا اور اس کا ماتھا چوم کر بولا۔

گوارٹر میں اکیلا بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ باہر چوکیدار گیٹ پر پہرہ دے رہا تھا۔ ظاہر ہے اسے ہدایات دی گئی تھیں کہ سینٹھ صاحب کی نئی بیوی باہر قدم نہ رکھنے پائے اب وہ کیا کرے؟ کونھی کی چار دیواری پر اپنی خاردار تار لگا تھا۔ باہر جانے کے سوائے گیٹ کے اور کوئی راستہ نہیں تھا اور گیٹ میں سے وہ باہر نکل نہیں سکتی۔ نغہ نے کھڑکی سے باہر دیکھا قیم خانے والے اچکن پوش منشی کا پرانا سائیکل پورچ میں کھڑا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ منشی چندہ لینے آیا ہے۔ وہ ڈرائیونگ روم میں آئی تو اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

”یگم صلیب! شاید آپ کو معلوم ہو کہ یہ خاکسار ہر ماہ قیم خانے کے لئے چندہ لینے حاضر ہوتا ہے اور سینٹھ صاحب قبلہ دل کھول کر ہمارے قیم خانے کی امداد فرماتے رہے ہیں۔“

اچانک نغہ کے ذہن میں فرار کا ایک راستہ نظر آیا۔ اس نے منشی کو بٹوں سے سو روپیہ نکال کر دیا اور کہا۔

”آپ اتنی دیر میں رسید نکلیں اور چائے پیتیں مجھے ذرا یہ اپنی ترکی ٹوپی دے دیں۔ میں اس کے نمونے کی ٹی کوزی بنانا چاہتی ہوں ذرا اندر جا کر اس کا نقشہ کاپی پر اتار لوں۔“

منشی پہلے تو ٹی کوزی کا سن کر اچھل پڑا۔ پھر سو روپے کے نوٹ نے اسے حواس باختہ کر دیا اور اس نے بڑی پھرتی سے ٹوپی اتار کر نغہ کے حوالے کی اور چائے پینے لگا۔ جب نغہ چلی گئی منشی نے چوری چوری سارے کمرے کا جائزہ لیا۔ پلیٹ میں سے چھ سات بسکٹ اٹھا کر اچکن کی جیب میں رکھے۔ ایک بسکٹ منہ میں رکھا اور بڑے اطمینان سے ڈکار مار کر الحمد للہ کہا اور چائے پینے لگا۔ نغہ نے دوسرے کمرے میں جاتے ہی سینٹھ کا پرانا میلا پاجامہ نکال کر پہنا۔ اوپر سے اچکن زیب تن کی۔ پاؤں میں چپل پہنی۔ بالوں کو گچھا بنا کر اوپر منشی کی پرائی ترکی ٹوپی رکھی۔ چہرے پر

سرم لے کر تھوڑی سی کالک ملی تمام زیورات اپن کی جیب میں ٹھونے اور دوسرے دروازے میں سے نکل کر باہر برآمدے میں آ گئی۔

اس وقت وہ بالکل ایک مرد معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے بڑی پھرتی کے ساتھ برآمدے میں پڑا ہوا سائیکل اٹھایا۔ اس پر سوار ہوئی اور سیٹی بجاتی سائیکل، برلہراتی، پینڈل مارتی بڑی تیزی سے چوکیدار کے قریب سے گزر گئی۔ چوکیدار کو وہم و گمان بھی نہ ہو سکا۔ کہ یہ قیم خانے کا منشی نہیں بلکہ سینٹھ کی نئی نوپلی دہن تھی۔ گیٹ سے باہر نکلتے ہی اس نے پوری قوت سے سائیکل چلانا شروع کر دیا اور فوراً علی اکبر کے کوارٹر میں پہنچ گئی۔ اس نے صحن میں اندر جا کر سائیکل رکھ دیا اور دروازے پر دستک دی۔

”جاوید دروازے پر نمودا ہوا“

”کس سے ملنا ہے بے لڑکے“

”جی علی اکبر سے“

”وہ یہاں نہیں ہے“

”آپ ہی مل لیجئے پھر حضور انور“

”کیا بکواس کر رہے ہو“

نغہ نے کہا۔ ”زبان سنبھال کر بولو سسر نہیں تو میں نوپلی اتار دوں گا۔“

جاوید اسے غور سے دیکھنے لگا۔ نغہ کھل کھلا کر ہنسی اور اس نے چشمہ اور نوپلی اتار دی۔

لبے بال سر پر سے کھل کر لہرانے لگے۔ جاوید بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔

”میری جان! یہ تم نے کیا بھیس بدل رکھا ہے۔ میں تو پہچان ہی نہیں سکا۔“

”اس قید خانے سے نکلتا کوئی آسان کام تھوڑے ہی تھا۔ تم میری جگہ

ہوتے تو تمہیں زنا نہ لباس پہن کر وہاں سے بھاگنا پڑتا۔“



جیم خانے کا منحنی سانسی کچھ دیر تو ڈرائنگ روم میں بیٹھا بڑے حُز سے بسکٹ کھاتا رہا لیکن جب بیگم صلابہ نے اندر کافی دیر لگا دی اور میز پر بسکٹوں کی پلیٹ بھی خالی ہو گئی تو بے چین سا ہو کر اٹھا اور بیگم صلابہ کو دو تین آوازیں دیں۔ مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ اندر کوئی ہوتا تو جواب دیتا۔ بیگم صلابہ تو اس وقت علی اکبر کے کوارٹر میں جاوید سے ہم آغوش تھی۔

منشی گوگو کے عالم میں باہر آ گیا۔ برآمدے میں میں آ کر اس نے دیکھا تو سائیکل غائب تھی۔ بڑا پریشان ہوا۔ فوراً چوکیدار کے پاس بھاگا اور اپنی سائیکل کا پوچھا۔

”منشی! تم تو ابھی ابھی سائیکل پر باہر نکلے تھے۔“

منشی نے روئی صورت بنا کر کہا۔

”اجی کون کافر باہر نکلا تھا۔ میں تو آدھ گھنٹے سے اندر بیٹھا ہوں۔“

چوکیدار چکر کھا گیا۔

”مگر تم نے نوپا پہن رکھی تھی اور سیٹی بجاتے میرے پاس سے نکل گئے تھے۔“

”اجی میں نے تو زندگی بھر کبھی سیٹی نہیں بجائی۔ یہ دیکھئے میرے اگلے

جاوید ہنس دیا اور نعرہ کو آغوش میں لے کر اندر لے گیا۔

”بابا کہاں ہیں؟“

”اب انہیں میرے ابا جان کہا کرو جاوید!“

”اور میں تمہیں نعرہ کہا کروں گا۔“

دونوں خوشی میں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ جاوید نے پھر پوچھا۔

”بابا کہاں ہیں نعرہ؟“ نعرہ نے بتایا کہ وہ اسے کہہ گئے تھے کہ تم کوارٹر میں پہنچ جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔

”وہ ہمیں یہاں سے فرار کروانے کے بندوبست کرنے گئے ہیں۔ جاوید پلیز سائیکل اندر کر کے رکھ لو۔ کیونکہ اگر سائیکل کسی نے دیکھ لی اور ہم پر آفت آ جائے گی۔“

جاوید نے جلدی سے اٹھ کر سائیکل کمرے میں لے کر اندر کر لی اور اس پر لحاف ڈال کر اسے بالکل چھپا دیا۔ اب دونوں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر پٹنگ پر بیٹھ گئے اور میٹھی میٹھی گلے شکوے کی باتیں کرتے ہوئے بابا کا انتظار کرنے لگے۔

زیورات لے کر بھاگ گئے۔ میں تم لوگوں کے خلاف ڈاکے کے الزام میں رہت لکھوار ہا ہوں۔ نہیں تو ایک روز کے اندر اندر نقد پیدا کر کے دو۔

مجمو بانی کو غش آنے لگا۔ پرویز کے ہاتھ سے سگریٹ گر پڑا۔ اس کم بخت نے انہیں پریشان کرنے کی انتہا کر دی تھی۔ ظالم کی بچی شادی کے بعد بھی فرار ہو گئی۔

علی اکبر بڑا خوش ہو رہا تھا کہ اس کی بیٹی ظالموں کے پنگل سے نکل کر اس وقت اپنے مستقبل کے شوہر جاوید کے پاس اس کے کوارٹر میں محفوظ بیٹھی ہے۔ سینٹھ نے قصد آمد نامی کے ڈر سے پولیس میں رپٹ درج نہ کروائی۔ لیکن اس نے مجمو اور پرویز پر پورا دباؤ ڈالا۔ مجمو اور پرویز بھاگے بھاگے سینٹھ کی کوٹھی پہنچ گئے۔

”مجمو! میں اسے ہرگز ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ صبح میرا نکاح ہو اور شام کو میری دلہن مع زیورات کے غائب کروادی جائے۔ میں تم دونوں کو اپنی میٹم دیتا ہوں کہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر میری بیوی کو جس طرح سے بھی ہوتا تلاش کر کے میرے گھر پہنچا دیا جائے ورنہ میں چوری اور اغوا کا تم دونوں کے خلاف مقدمہ دائر کر دوں گا۔“

مجمو نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”سینٹھ صاحب! اس میں میرا کوئی قصور نہیں مجھے کیا ضرورت تھی کہ اپنی بیٹی کو اغوا کرواتی پھروں۔ اپنی روزی پر کون لات مارتا ہے۔ ہونہ ہو یہ جاوید کی کارستانی ہے۔“

”کچھ بھی ہو اس کی ذمہ داری تم دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتا تم لوگوں نے اسے کیا سکھایا ہا کر یہاں بھیجا تھا۔“

پرویز نے کہا۔

دونوں دانت ٹوٹے ہوئے ہیں۔“

”تو پھر وہ کون تھا؟“

”کون کون تھا؟ فشی نے پوچھا۔“

”وہی جو سائیکل پر تمہارا حلیہ بنا کر گزرا تھا؟“

”مجھے کیا معلوم؟ مارے گئے سائیکل بھی گئی اور نوپنی بھی۔ سائیکل تو یتیم خانے کی تھی؟“

چوکیدار نے پوچھا۔

”تمہاری نوپنی کہاں ہے؟“

فشی نے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

”اندر بیگم صاحبہ نے منگوائی تھی۔“

چوکیدار کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے فوراً نوکرانی کو بلوا کر اندر بیگم صاحبہ کی موجودگی دریافت کرنے بھیجا۔ نوکرانی نے آ کر کہا کہ اندر بیگم صاحبہ کہیں نہیں ہیں۔ چوکیدار کا رنگ اڑ گیا۔

اسنے میں سینٹھ کی بڑی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ علی اکبر گاڑی چلا رہا تھا سینٹھ نے گیٹ پر نوکروں کا مجمع دیکھا تو گاڑی روک لی۔

”کیا بات چوکیدار؟ یہاں کیوں بھیڑ لگا رکھی ہے؟“

چوکیدار کی زبان لڑکھڑائی تھی۔ جب اس نے بڑی مشکل سے ڈرتے ڈرتے اصل حقیقت بیان کی تو سینٹھ گاڑی میں سے نکلا۔ چوکیدار کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا اور کوٹھی میں تیزی سے آ گیا۔ اس نے اندر آ کر ایک ایک کمرہ تلاش کر مارا مگر نقد کا کہیں سراغ نہ ملا۔ سینٹھ نے دیکھا کہ زیورات کے ڈبے کھلے اور خالی پڑے تھے۔ دوسرے پیٹ کر رہ گیا۔ نقد سارے زیورات ساتھ لے کر وہاں سے فرار ہو چکی تھی۔ اس نے جہت مجمو بانی کو فون کیا۔ اور کہا کہ نقد سارے



بند و بست خود کر لوں گا۔"

سینھ نے علی اکبر کے علاوہ اور لوگ بھی نغہ کی تلاش میں لگا دیے۔ قسیم خانے کے منشی نے جو ابھی تک باہر برآمدے میں بیٹھا اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔ گڑگڑا کر کہا۔

"سینھ صاحب میری سائیکل کا کیا بنے گا حضور! مجھے تو سینئر قسیم خانے سے نکال دے گا اور میری تنخواہ بھی ضبط کر لے گا۔ میں تو اجڑ جاؤں گا حضور! ترکی نوپی میں خرید لوں گا لیکن سائیکل حضور میں سات پشتوں تک نہیں خرید سکتا۔"

نکو اس بند کرو۔ چا کر منشی سے دو سو روپے لے لو اور یہاں سے چلتے بنو۔"

"بہت اچھا حضور!"

منشی کو ڈیڑھ سو روپے کا فائدہ ہوا تھا۔ کیونکہ نغہ نے جو اسے سو روپے چندے کا دیا تھا اس کی ابھی اس نے رسید نہ بنائی تھی۔ ڈیڑھ سو سائیکل کی قیمت تھی اور ڈیڑھ سو اس کا اپنا تھا۔ ٹوپی کی قیمت ساڑھے گیارہ آنے تھی۔

علی اکبر کاڑھی لے کر ہوائی اڈے جانے کی بجائے سیدھا اپنے کوارٹر میں آ گیا۔ یہاں نغہ اور جاوید اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

"کیا ہوا تاجاں!"

"کچھ نہیں بیٹی۔ ڈاکوؤں کا لوٹا ہوا مال ہاتھ سے نکل گیا ہے وہ پریشان ہیں مگر تم لوگ فکر نہ کرو۔"

جاوید نے کہا۔

"بابا اگر میں نغہ کو لے کر گھر لے جاؤں تو میرا خیال ہے ابا جان میری مدد کریں گے۔"

"سینھ صاحب یہ محض آپ کا دم ہے اگر ہمیں آپ کے ساتھ دھوکا بازی کرنی ہوتی تو اس کی شادی آپ سے کبھی نہ کرتے۔ ہم ساری عمر آپ کو جمل دے سکتے تھے۔ مگر ہم نے تو نیک نیتی سے کام لے کر اس کی شادی کر دی۔ خواہ آپ سے سودا کیا۔ لیکن نکاح بھی پڑھا دیا۔ وہ آپ کی باقاعدہ بیوی بن گئی۔ اب اس کی حفاظت کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی تھی نہ کہ ہم پر۔ اس کے باوجود ہمیں آپ سے پوری ہمدردی ہے اور ہم اس کی تلاش میں شہر کا کونہ کونہ چھان ماریں گے۔"

"بہر حال اتنی دیر تک میں آپ کی کوشی اور کار ضبط کرتا ہوں اور آپ کو نوٹس دیتا ہوں کہ اگر آپ ایک ہفتے کے اندر اندر میری بیوی کو تلاش کر کے مجھ تک پہنچانے میں ناکام رہے تو نہ صرف یہ کہ تم لوگوں کو میرے سارے روپے واپس کرنا ہوں گے۔ بلکہ حوالات کی سیر بھی کرنی پڑے گی۔ کیونکہ میرے پاس نغہ کا نکاح نامہ موجود ہے۔"

مجمو بانی اور پرویز پر یہ ایک نئی مصیبت نوٹ پڑی تھی۔ کار اور کوشی ایک ہی روز میں انہیں ملی بھی اور ضبط بھی ہو گئی۔ تاجاں انہوں نے کار تو وہیں چھوڑ دی اور کوشی کی چابی سینھ کے حوالے کر کے اپنی پرانی دمنزلہ کوشی کا ایک پورشن کرائے پر لے کر وہاں چلے گئے۔ اب پرویز نے نغہ کی تلاش ایک بار پھر پوری سرگرمی سے شروع کر دی اور مجمو گھر بیٹھ کر سوائے پان کھانے آہیں بھرنے اور نغہ کو کوسنے کے اور کچھ نہ کرتی۔

سینھ نے علی اکبر کو کار دے کر کہا۔

"تم فوراً ہوائی اڈے پر جاؤ اور دیکھو کہ بیگم صاحبہ کسی کے ساتھ وہاں تو نہیں ہیں۔ اگر وہاں ہو تو فوراً انہیں پکڑ لیا مجھے فون کر دو۔ میں باقی

پر چھوڑ کر علی اکبر نے کہا۔

”اب میں کبھی دل کے ساتھ تم دونوں بچوں کو تمہاری بھلائی کی خاطر اکیلا چھوڑتا ہوں۔ تم صبح تک فٹ کلاس وینٹ روم میں آرام کرو۔ صبح کی گاڑی سے لاہور چلے جانا اور اپنی خیریت کا خط ضرور لکھنا۔ میں بھی کراچی کے سارے حالات سے تمہیں باخبر کرتا رہوں گا۔“

نفر باپ سے لپٹ کر رونے لگی۔ باپ نے اسے پیار کیا اور پھر جاوید کا ہاتھ چوم کر آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھتا گاڑی میں آ گیا اور واپس کراچی کی طرف روانہ ہو گیا۔ نفر نے برقعہ پہن لیا تھا اور جاوید نے بھی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ دو بجے رات سے دوسرے روز آٹھ بجے تک ریلوے کے فٹ کلاس وینٹ روم میں آرام کیا۔ صبح گاڑی آئی تو فٹ کلاس کے وینٹ لے کر وہ دونوں ریل میں سوار ہو گئے اور لاہور کی طرف چل پڑے۔ علی اکبر نے اگلے روز رات کو قیم خانہ کے فشی کا سائیکل کار کے پیچھے ڈگی میں چھپایا اور اسے شہر سے چند میل دور ایک نالے میں گرا کر واپس چلا گیا۔ لاہور پہنچ کر جاوید اور نفر نے برگنزا ہوٹل میں قیام کیا۔ جاوید نے یہاں اپنے جگری دوست کو ہوٹل میں بلا کر پوری صورت حال سے باخبر کر دیا۔ پہلے تو اس نے گلہ کیا کہ وہ اس کے ہاں کیوں نہیں ٹھہرا۔ جاوید نے کہا۔

”تم جانتے ہو کہ ہم کس حالت میں چھپتے پھر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر تمہارے ہاں آ کر اترتے تو پکڑے جانے کا اندیشہ تھا۔ پھر تم پر بھی کوئی آفت آ جانے کا ڈر تھا۔ بہر حال اب یہ پوزیشن ہے کہ تم یہاں اپنے کسی قابل اعتماد دوکیل دوست سے مشورہ کرو کہ نفر سینہ سے یک طرفہ طلاق کیسے حاصل کر سکتی ہے تاکہ بعد میں ہم دونوں بیاہ کر لیں اور بے

علی اکبر نے کہا۔

”تم بھول گئے ہو کہ نفر شادی شدہ لڑکی ہے۔ سینہ کے پاس اس کا نکاح نامہ اس کے دستخطوں کے ساتھ موجود ہے اور یہ جرم ہے۔ احمد صاحب پر نئی مصیبت آ جائے گی۔ ابھی گھر جانے کا وقت نہیں آیا۔ میں نے بچا بچا کر سو روپے جمع کئے ہیں تم لوگ، یہ لے لو اور لاہور کی طرف نکل جاؤ۔ جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو واپس آ جانا۔“

نفر نے کہا۔

”لیکن ابا جان پولیس ہمیں پکڑے گی۔“

علی اکبر نے کہا۔

”سینہ نے بدنامی کے خوف سے ابھی پولیس میں رپٹ نہیں لکھوائی۔“

جاوید بولا ”یہ اور بھی اچھا ہے۔ آپ اپنے روپے اپنے پاس ہی رکھیں۔“

میرے پاس کافی روپیہ موجود ہے جب ختم ہو جائیں گے تو آپ کو لکھ

بھیجوں گا۔“

علی اکبر نے نفر کے باپ نے آزرہ ہو کر کہا۔

”کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی بیٹی کو رخصتی کے وقت کچھ بھی نہ دوں۔“

جاوید نے مجبوراً روپے لے کر نفر کو پکڑا دیئے۔ حقیقتاً جاوید کو ان روپوں کی ضرورت نہ

تھی۔ کیونکہ اس کے پاس پانچ ہزار کے قریب روپے موجود تھے ان کا بندوبست اس نے پہلے ہی

سے کر رکھا تھا۔

رات کے پورے بارہ بجے علی اکبر نے ان دونوں کو گاڑی میں بٹھلایا اور پوری رفتار پر

حیدر آباد جانے والی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں وہ حیدر آباد پہنچ گیا۔ انہیں اسٹیشن



چوکیدار سے کہلو کر جاوید نے آگ جلوائی۔ پانی گرم کروایا۔ دونوں نے باری باری غسل کیا۔ دوسرے گرم کپڑے پہنے۔ ہونٹ سے چائے منگوائی اور آتشدان میں آگ جلوا کر بیٹھ گئے اور چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ نغمہ نے مسکرا کر کہا۔

”مجھے تو یہ سارا کچھ خواب معلوم ہو رہا ہے۔ کل تک کراچی کے ریستائوں میں گھوم رہی تھی اور آج مری کی پہاڑیوں میں برف پوش وادی میں آتشدان کے سامنے بیٹھے آگ تاپ رہی ہوں۔“

”اور آگ تاپتی کس قدر حسین لگ رہی ہو۔“

نغمہ شرما گئی۔

”کسی کو بتانا تو کوئی تم سے سیکھے۔“

جاوید نے نغمہ کا گرم گرم ہاتھ تھام لیا۔

”میں بتا نہیں رہا نغمہ! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تمہاری آنکھوں میں ایک جادو ہے۔ اس جادو نے مجھے مسحور کر لیا ہے۔ سب سے پہلا تیر تمہاری آنکھوں نے چلا کر مجھے گرایا تھا نغمہ۔“

نغمہ کا رنگ سرخ ہو گیا اور اس نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ جاوید نے اسے آنکھوں میں لے کر اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ نغمہ کا جسم ایک سحر انگیز لذت میں ڈوب گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے جسم پر کوئی پھولوں کی بارش کر رہا ہے۔

شام کو دونوں گرم اور روکٹ اور اونی ٹوپیاں پہن کر سیر کو باہر نکلے۔ وہ کلڈن روڈ پر نیچے چوک تک چلے گئے۔ درخت برف سے چھپے ہوئے تھے اور سڑک پر بھی کہیں کہیں برف پڑی تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی تھیں۔ پہاڑ پر سردیوں کا موسم بھی عجیب ہوتا ہے۔ برف پوش درختوں پر کوئی پرند شام کو نہیں چھپتا۔ دور دور تک کوئی آدمی

فکری سے گھومیں، پھریں۔

جاوید کے دوست نے اپنے ایک ایڈوکیٹ دوست سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ لڑکی اگر ایک گھنٹے کے لئے عیسائی ہو جائے تو وہ ایک طرف طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ نغمہ نے اپنا مذہب چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ جاوید نے ویسے ہی سول کورٹ میں تنبیخ نکاح کا نغمہ کی جانب سے دعوے دائر کروا دیا۔ سینھ کا نام پتہ غلط بتایا۔ اخبار میں نوٹس شائع ہوا۔ سچے روز تک کوئی عدالت میں حاضر نہ ہوا۔ نغمہ کو عدالت کی طرف سے ایک طرف طلاق مل گئی۔ طلاق لے کر وہ دونوں لاہور سے ایک رات کار کے ذریعے پنڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسی روز وہ پنڈی سے کوہ مری چل پڑے۔ دسمبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ پنڈی میں سخت سردی تھی۔ ظاہر ہے مری میں بھی شدید سردی ہو گئی۔

لیکن جاوید نے وہ جگہ اس لئے پسند کی تھی کہ وہاں انتہائی سکون ہو گا اور وہاں کوئی ان کی تلاش میں نہیں پہنچ سکے گا۔ کار کوئی تین بجے بعد از دوپہر راولپنڈی سے مری کی طرف روانہ ہوئی اور ڈیڑھ گھنٹے بعد سنی بنک کے پاس پہنچ گئی۔ سنی بنک سے ہی برف نظر آتی شروع ہو گئی۔ دوبار برف باری ہو چکی تھی۔ سڑک کے کنارے سفید سفید برف جمی ہوئی تھی۔ مکان کی چھتوں، چھجوں اور درختوں پر بھی برف نظر آ رہی تھی۔ سردی بے حد ہو گئی تھی۔ نغمہ نے برقعے کے اندر گرم کوٹ پہن رکھا تھا۔ پھر بھی اسے سردی لگ رہی تھی۔ نیکی ڈرائیور کو انہوں نے اوپر مال پر جا کر ڈاک خانے کے پاس اتر کر واپس رخصت کروا دیا۔ جاوید نے ڈاک خانے کے پیچھے کلڈن روڈ پر بہت نیچے جا کر ایک درختوں میں چھپے ہوئے گنٹام سے کانچ کا بندوبست پنڈی میں ہی کر لیا تھا اور اس کی چابی حاصل کر لی تھی۔ دو بستر اور دیگر معمولی ضروریات کا سامان بھی انہوں نے پنڈی سے خرید لیا تھا۔

کانچ میں آ کر انہوں نے لیٹر اکریا۔ دو کمروں، ہاتھ روم اور کلرک روم پر مشتمل ایک پیارا سا کانچ تھا۔ پلنگ اور دیگر فرنیچر اندر موجود تھا۔ نغمہ نے فوراً دونوں کمروں میں سامان سجا دیا۔



نظر نہیں آتا۔ گرمیوں میں جہاں فیشن پرست لڑکیوں اور لڑکوں کا سیلاب لٹا ہوتا ہے وہاں اب کہیں کہیں سوائے گیدڑوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا۔ دیہاتی لوگ کبھی دکھائی دے جاتے ہیں۔ نیچے وادی سے اوپر آ کر گھڑی دو گھنٹی دم لیتے ہیں اور پھر کسی وادی میں اتر جاتے ہیں۔ ان دونوں کے چھپنے کے لئے یہ جگہ بڑی ہی موزوں تھی۔ جاوید نے حالات کی پوری تفصیل علی اکبر کو لکھ دی تھی۔ دوسرے روز علی اکبر کا کراچی سے خط آیا جس میں اس نے دونوں کو پیار لکھا تھا اور کہا کہ سیٹھ نے ان دونوں کی تلاش میں کونہ کونہ چھان مارا ہے اور اب ناامید ہو گیا ہے۔ نفعہ کی ماں سے کار اور کوٹھی ضبط ہو گئی ہے۔ جاوید کے باپ کی پریشانی میں نے مل کر دور کر دی ہے سیٹھ کھل کر سامنے نہیں آتا۔ وہ جاوید کے مجسٹریٹ باپ سے ڈرتا ہے اور پھر اسے اپنے خاندان اور اپنی کاروباری شخصیت کے بدنام ہو جانے کا بھی ڈر ہے۔ اس کی پہلی بیوی نے حیدر آباد سے واپس آ کر اپنا گھر پھر سے سنبھال لیا ہے۔ تم لوگ جہاں بھی ہو۔ ابھی اطمینان سے رہو۔ یہ اچھا کیا کہ تم نے نفعہ کو طلاق دلوادی۔ اب تم فوراً کسی طرح شادی کرلو۔ یہ بڑی ضروری بات ہے اس پر خط ملتے ہی عمل درآمد شروع کر دینا۔ باقی پھر نکھوں گا۔ تمہیں پیار اور نفعہ بیٹی کو دیدہ بوسی۔

تمہارا باپ \_\_\_\_\_ علی اکبر

خط پڑھ کر جاوید نے نفعہ کی طرف دیکھا۔

”اب شادی کیسے ہو؟“

”میں کیا بتاؤں؟“ نفعہ نے شرما کر کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جاوید نے سوچا کہ علی اکبر نے ٹھیک لکھا ہے۔ ان کی شادی بڑی ضروری ہے۔ ورنہ ان کے ہر لمحہ پکڑے جانے کا ڈر ہے۔

دوسرے روز نفعہ کو جاوید نے ساتھ لیا اور نیچے پنڈی آ گیا۔ یہاں اس کا ایک دوست اسٹنٹ ایکٹر اکشر لگا تھا۔ اس سے مل کر اس نے عدالت میں شادی کی درخواست دے دی اور

اسی دن اس کی نفعہ سے سول میرج ہو گئی۔ شادی کرنے کے بعد دونوں خوشی خوشی عدالت سے باہر نکلے۔ جاوید نے نفعہ کو بہت سی چیزیں خرید کر دیں اور شام کو وہ ٹیکسی میں سوار ہو کر واپس کوہ مری اپنے کالج میں آ گئے۔

آج رات ان کی سہاگ رات تھی۔ نفعہ نے غسل کر کے نئے کپڑے پہنے عطر لگایا اور دلہن بن کر جاوید کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”یہ چاند آج میرے کمرے میں کہاں سے آ گیا؟“

جاوید نفعہ کا نکھر اہوا حسن دیکھ کر بے حد متاثر ہوا۔ نفعہ واقعی دلہنوں کے لباس میں بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ جاوید نے انھہ کرا سے اپنے سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔ پھر انہوں نے ساتھ مل کر بہترین کھانا ہوٹل سے منگوا کر کھایا۔ کافی پی اور آشدان کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد نفعہ اندر خواب گاہ میں چلی گئی۔ جاوید کچھ دیر وہاں بیٹھا اخبار دیکھتا اور سگریٹ پیتا رہا۔ پھر وہ بھی اٹھا اور اندر خواب گاہ میں آ گیا۔

یہاں اس نے دیکھا کہ نفعہ دلہن بنی چنگ پر شرما رہی ہے۔ جاوید آہستہ آہستہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ نفعہ نے اور سر نیچا کر لیا۔ جاوید نے آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ پھیرا۔

”نفعہ! آج ہماری شادی کی رات ہے۔ ہماری زندگی کی پہلی حسین ترین رات ہے۔ اس رات کے خواب ہم نے دن کو دیکھے تھے۔ اس کے لئے ہم نے دعائیں مانگی تھیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں نفعہ؟ تم بولتی کیوں نہیں؟“

نفعہ خاموش رہی جاوید نے جھک کر اسے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”خوشی کے وقت یہ آنسو کیوں نفعہ؟“

نفعہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر اس نے اپنا سر آہستہ سے اٹھایا اور انگلیاں آنکھوں سے



جاوید کی طرف دیکھا۔ جاوید نے اپنے عطر آلود ریشمی رومال سے نغہ کے آنسو پونچھے۔ نغہ مسکرائی۔ جاوید کو یوں لگا جیسے بادل چھٹ گئے ہوں اور سورج نکل آیا ہو۔ روشن دھوپ وادی میں چمکنے لگی ہو اچانک باہر بادلوں میں گرج پیدا ہوئی۔ اور دریاؤں کا شور زیادہ تیز ہو گیا۔ جاوید نے کھڑکی کے پاس جا کر باہر جھانک کر دیکھا تو اندھیرے میں اسے سفید سفید برف کے پھول مسلسل گرتے نظر آئے۔

”نغہ برف گر رہی ہے۔ ادھر آ کر دیکھو کتنی پیاری لگ رہی ہے۔“

نغہ چنگ پر سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ گئی۔ جاوید نے کھڑکی کا پت کھولا تو زبردست سرد ہوا کے تیز جھونکے اندر آنے لگے۔

”خدا کے لئے کھڑکی بند کر دیں۔“

جاوید نے فوراً کھڑکی بند کر دی۔

”اتنی سرد ہوا تھی کہ میرے ہونٹ جسنے لگے تھے۔“ جاوید نے نغہ کے ہونٹوں کو چوم کر کہا۔

”یہ ہونٹ تو دودھ پکتے ہوئے شعلے ہیں اور شعلوں پر کبھی برف نہیں

جم سکتی۔“

پھر وہ بچوں کی طرح بند کھڑکی کے شیشوں سے لگ کر کھڑے ہو گئے اور باہر گرتی برف کا نظارہ کرنے لگے۔ آسمان گہری تاریکی میں گم تھا۔ تیز ہوائیں شور مچا رہی تھیں اور برف مسلسل گر رہی تھی۔ جاوید نے نغہ کو آغوش میں لے لیا اور دونوں چنگ پر آ کر بیٹھ گئے۔ جاوید نیم دراز ہو گیا۔ اس نے نغہ کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں اور اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دئے۔ کتنی ہی دیر دونوں محبت کی بیباکی سے اس طرح ایک دوسرے کو پیار کرتی رہیں، پھر جاوید نے جتنی کل تڑوی اور دونوں لحاف میں ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر سو گئے۔

پہاڑ پر آئے انہیں ایک ہفتہ گزر گیا۔

اس دوران مری میں دو بار برف باری ہوئی نغہ کے لئے یہ زندگی کے حسین یادگار دن تھے۔ جاوید نے کمرے سے اس کی کئی ایک تصویریں اتار لی تھیں۔ سارا سارا دن وہ برف پوش سڑکوں پر گھومتے رہتے۔ اب وہ میاں بیوی تھے۔ انہیں کسی قسم کا ڈر خوف نہیں تھا۔ علی اکبر کا کراچی سے خط بھی آچکا تھا کہ تم لوگ واپس کراچی آ کر اب اپنے آپ کو ظاہر کر دو۔ ایسا ہی ایک خط جاوید کے والد صاحب نے بھی اسے تحریر کیا تھا جس میں لکھا تھا۔ کہ اگر تم لوگوں نے شادی کر لی ہے تو اب کسی قسم کا خطرہ نہیں اور بے فکر ہو کر کراچی واپس آ جاؤ۔ تمہاری والدہ تمہاری جدائی میں تمہارا غم کھا رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے تین روز بعد مری سے واپسی کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ آخری دو روز انہوں نے نے جھیک کا گلی تک لمبی لمبی سریں کیں۔ مری میں سمیر ہوٹل ہی کھلا تھا۔ سمیر میں بیٹھ کر وہ کافی بڑے شوق سے پیا کرتے۔ ایک شام کو سمیر میں بیٹھے کافی پی رہے تھے کہ اچانک باہر برف باری شروع ہو گئی۔

یہ منظر اس قدر دردناک تھا کہ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھے، گرم گرم کافی کی پیالیاں ہاتھوں میں تھامے اسے مزے سے دیکھنے لگے برف باری کوئی بیس منٹ جاری رہی۔ سمیر بخارچی میں

آگ دہک رہی تھی اور اندر کی فضا بڑی گرم ہو رہی تھی۔

بخارچی کے پاس ایک بھاری بھلم شکاری بیٹھا اپنے ساتھی کو نتھیا گلی کے جنگلوں میں پیچھے کے شکار کا قصہ سناتا تھا۔ اس کی آواز انہیں صاف سنائی دے رہی تھی۔

”خیراگلی سے ہم تھپہ میل اوپر چلے گئے ہوں گے کہ اچانک جنگل میں چیتے کی دھاڑ سنائی دی۔ ابھی ہم سنبھل بھی نہ سکے تھے کہ ترائی سے اتر کر چیتے نے سڑک پر چھلانگ لگا دی اور سڑک کے بیچ میں کھڑے ہو کر ہماری جیب کی طرف غضبناک نظروں سے دیکھنے لگا بس پھر کیا تھا۔ ہم نے بند و قیں سنبھالیں اور تڑا تڑا اس پر ایک ساتھ چھ فائر کر دیئے۔ دو فائر کارگر ہوئے اور گولیاں پیچھے کی کھوپڑی میں گھس گئیں۔ پیچھے نے ایک دلدوز چیخ کے ساتھ گیارہ فٹ اونچی قلا بازی لگائی اور دھپ سے مردہ ہو کر سڑک پر گر پڑا۔“

برف گر رہی تھی۔ بخارچی گرم تھی۔ شکاری قصہ سناتا تھا اور کافی میں سے نیم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ جاوید اور نفعہ دونوں شکاری کی باتیں بھی سن رہے تھے۔ برف باری بھی دیکھ رہے تھے اور مسکرا کر ایک دوسرے کو بھی دیکھ لیتے تھے۔ اچانک نفعہ نے محسوس کیا کہ سمیر ہوٹل کے دوسرے کونے میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا ایک اونچا لمبا اور کوٹ پہنے بیٹھا آدمی اس کی طرف غور سے دیکھ رہا ہے۔ پہلے تو نفعہ نے محسوس کیا کہ وہ ایسے ہی تک رہا ہے جیسے کہ ہمارے ہاں غیر مرد عورتوں کو گھور کر دیکھتے ہیں۔ لیکن جب اس نے مسلسل اسے گھورتے پایا تو وہ گھبرا سی گئی اور جاوید سے واپس گھر چلنے کو کہا۔ جاوید نے بل ادا کیا اور کوٹ پہنا۔ گلے کے گرد مٹھر لپیٹا۔ چھڑی اٹھائی اور خوشی خوشی نفعہ کا بازو تھام کر سمیر ہوٹل سے نیچے اترنے لگا۔ سڑکیوں سے نیچے اتر کر نفعہ نے ہوٹل کے آگے سے گزرتے ہوئے اوپر نگاہ کی تو وہ آدمی کھڑکی پر جھکا اسے جاوید کے ساتھ جاتے

بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تجسس اور تماش تھی۔

نفعہ کانپ گئی۔ مگر اس نے جاوید سے کوئی بات نہ کی۔ برف باری ابھی تک ہو رہی تھی۔ برف کے پھول نفعہ اور جاوید کے اور کونوں اور ادنیٰ ٹوپوں پر گر رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کندھے جھٹک کر برف نیچے گرا دیتے۔ نفعہ فوراً گھر جانا چاہتے تھے۔ لیکن جاوید نے اصرار کیا کہ ایک چکر اوپر کا لگایا جائے۔ چنانچہ وہ اوپر سیر کو چل دیئے۔ جب واپس آئے تو ڈاک خانے کا موڑ گھومتے ہوئے نفعہ نے پھر اسی چھوٹی چھوٹی مونچھوں والے اونچے لمبے آدمی کو ایک طرف ریگ کے ساتھ لگ کر کھڑے پایا۔ نفعہ کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔ اسے خواہ مخواہ وہم ہونے لگا کہ یہ شخص ضرور ان دونوں کی جانی اور شادی شدہ حسین ترین زندگی کی بربادی کا باعث بن کر مری میں نمودار ہوا ہے۔ اس نے نفعہ کو قریب سے گزرتے ہوئے پھر بڑے غور سے اور گہری نظروں سے دیکھا۔ کالج کے قریب پہنچ کر جب نفعہ گیٹ میں داخل ہونے لگی تو اس نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔

وہ آدمی ذرا پرے چڑھ کے ایک برف پوش درخت کے نیچے کھڑا تھا اور اس کے کالے لمبے کوٹ کے کندھوں پر برف پڑی ہوئی تھی۔ نفعہ جلدی سے جاوید کے ساتھ کالج میں داخل ہو گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ اس نے اس پر اسرار آدمی کے بارے میں جاوید سے بات کی اور کھڑکی میں سے وہ آدمی دکھانے کی کوشش کی۔ مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ چڑھ کے درخت کے نیچے سے جا چکا تھا۔

”تمہارا وہم ہوگا۔ بھلا یہاں ہمارا پیچھا کون کر سکتا ہے۔“

”نہیں جاوید! میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“

”بہر حال میں نے اسے نہیں دیکھا اور اگر اس نے ہمیں دیکھ بھی لیا تو کیا

ہوا۔ اگر وہ سینہ کا آدمی بھی ہو تو کیا ہے ہم شادی شدہ ہیں اور کل ہم

واپس کراچی جا رہے ہیں۔ وہاں جا کر تو ہم اپنے آپ کو بدالت میں



سردی میں ٹھنڈ کر کر رہے اور چھینے کی آواز آ جاتی تھی۔ کھڑکی پر سے پردہ ہٹا ہوا تھا اور اس نے شیشوں میں سے باہر تاریک رات میں سفید برف سفیدی کے ایک دھندلے دھبے کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ جاوید کو اچانک یوں لگا جیسے کسی نے کھڑکی کے شیشے کے ساتھ سر لگا کر اندر دیکھنے کی کوشش کی ہو اور پھر اچانک سر پیچھے ہٹا لیا ہو۔

وہ ڈر سا گیا۔ اس نے اپنا سانس روک لیا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کھڑکی کے شیشوں کو ٹکٹے لگا۔ ہوائیں چیخ رہی تھیں۔ کھڑکی کے شیشے سفید دے لگ رہے تھے۔ ایک بار پھر یہ دھبے ایک طرف سے بالکل سیاہ ہو گئے۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی شخص شیشوں کے ساتھ لگا کھڑا ہے۔ اور اندر جھانک رہا ہے۔ جاوید زور سے کھانسا۔ ایک سیکنڈ میں وہ سایہ پیچھے ہٹ گیا۔ اب جاوید کا شک یقین میں بدل گیا۔ کوئی شخص یقیناً ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ ان کی نقل و حرکت کو دیکھ رہا ہے۔ لیکن وہ یہاں آدمی رات کے بعد کیا کر رہا ہے؟ جاوید کی نیند اڑ گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سے لحاف میں سے باہر نکلا۔ کاغذی گرم گاؤں پہنا۔ دے پاؤں دوسرے کمرے میں جا کر گرم سلپر پہنے۔ الماری کا پت کھول کر اندر سے پستول نکالا۔ اسے کھول کر ہاتھ لگا کر دیکھا۔ وہ بھرا ہوا تھا۔ اور غسل خانے کی کھڑکی کے شیشے میں سے وہ باہر کا سارا منظر دیکھ سکتا تھا۔ وہ دے پاؤں آگے بڑھ کر کھڑکی کے پاس آیا اور اس کے آگے رکھے ہوئے میز پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ کھڑکی کے کیواڑ اندر سے بند تھے اور باہر کی جانب لگی ہوئی لوہے کی سلاخوں پر برف جمی ہوئی تھی۔

جاوید نے کھڑکی کے ساتھ لگ کر باہر دیکھنے کی کوشش کی باہر رات کی تاریکی میں سفید برف کی چادر بچھی تھی جس کی وجہ سے منظر وحیما وحیما سا اجاگر ہو گیا تھا۔ باہر گہرا سناٹا طاری تھا۔ یہاں سے اسے اپنی خواب گاہ کی کھڑکی صاف نظر آ رہی تھی۔ غسل خانے میں غضب کی سردی تھی اور کھڑکی کی درزوں میں سے بخ بست ہوا اندر آ رہی تھی۔ جاوید کی ناک اور منہ برف کی مانند ہو گئے۔ گہرے بیٹھا رہا اور باہر نظریں جمائے رہا۔ چھ دیروہاں گہری ویرانی چھائی رہی۔ جاوید نے

پیش کر ہی دیں گے۔ ان باتوں سے اب کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم اطمینان رکھو۔

ساری رات برف باری ہوتی رہی۔ آٹھ بجے کے بعد برف باری پھر شروع ہو گئی تھی جو رات بھر جاری رہی۔ جاوید نے کمرے کے دروازے نفذ کے کہنے پر اندر سے اچھی طرح بند کر لئے تھے۔ آتش دان میں آگ جلا دی تھی۔ بتیاں گل کر دی تھیں۔ نفذ اس کے ساتھ پنک میں دبک کر لیٹی تھی۔ اسے خواہ مخواہ ڈر لگ رہا تھا۔ جانے کس وقت نفذ سو گئی۔ جاوید نے اس پر اچھی طرح لحاف ڈالا اور خود ہی جلا کر کوئی ناول پڑھنے لگا۔ کیونکہ یہ اس کی عادت تھی کہ وہ رات کو پڑھتا ضرور تھا۔

اچانک اسے یوں لگا جیسے کسی نے دروازے پر دو بار زور سے ہاتھ مارا ہوا۔ جاوید نے دروازے کی طرف دیکھا وہ بند تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے باہر برف گرنا بند ہو گئی تھی اور اب تیز ہوائیں شور مچاتی گذر رہی تھیں اور گرمی ہوئی برف کو ٹنڈ کر رہی تھیں۔ جاوید نے سوچا اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ نہیں یہ میرا وہم ہوگا اور وہ پھر ناول پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ ویسا ہی کھڑا کھڑا پھر ہوا۔ اب کے جاوید کو پسینہ آ گیا۔ آدمی رات کو اس سنان جنگل میں کون ہو سکتا ہے؟ اسے اس آدمی کا خیال آ گیا جس کا ذکر نفذ نے اس سے کیا تھا۔ جاوید خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اسے گینڈر کی دو تین دہشت ناک چھین سنائی دیں۔

جاوید سمجھ گیا کہ گینڈر کو دروازے کی درز میں سے گوشت اور کھانوں کی بو آئی ہوگی اور اس نے دروازے پر پتھے مارے ہوں گے۔ اس کا فکر دور ہو گیا اور وہ پڑے اطمینان سے کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ مگر اب مطالعے میں اس کا جی نہ لگا۔ اس نے بتی بجھائی اور لحاف اوپر کر کے نفذ کی کمر میں بازو ڈال کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اب اس نے ارد گرد گہری خاموشی تھی۔ اس خاموشی میں باہر تیز ہواؤں کا شور ہی نفل ہو رہا تھا۔ یا کسی وقت دور سے کسی گینڈر کے



تک کر رہا تھا میں نے ہوا میں فائر کر کے اسے ذرا لرہکا دیا۔

”خدا کے لئے یہاں سے چلے چلو۔ مجھے اب یہاں ڈر لگتا ہے۔“

”میری جان کل شام کو ہم واپس جا رہے ہیں۔“

”کل شام نہیں کل صبح ہی چلو۔ اب میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ یہاں میرا

خون خشک ہونے لگا ہے۔“

جاوید نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

”تم تو خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہو۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کوئی کچھ

نہیں کہہ سکتا۔ کل صبح شاپنگ کریں گے نیچے لوئر بازار سارا کھلا ہے۔

وہاں تمہیں یہاں کی خالص لٹریچر چیزیں ملیں گی اور تیسرے پہر یہاں

سے چل پڑیں گے۔ میں نے ٹیکسی کا بندوبست کر لیا ہے۔“

نفسہ جاوید کے سامنے انکار نہ کر سکی اور اس کی آغوش میں سر دے کر سو گئی۔ جاوید کو

رات بھر پوری طرح نیند نہ آ سکی۔ اس کا ذہن ساری رات یہ معملہ کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ یہ

لوگ ڈاکو تھے۔ یا سینکڑوں غنڈے تھے جو نفسہ کو اغوا کرنے آئے تھے۔ مگر یہ معملہ حل نہ ہو سکا اور صبح

ہو گئی۔ صبح سب سے پہلے جاوید نے دروازہ کھولا اور باہر جا کر وہ جگہ دیکھی جہاں رات اس نے

گولی چلائی تھی۔ رات بھر کی سرد ہوانے برف کو بچھ کر دیا تھا اور خواب گاہ کی کھڑکی کے نیچے خون

کے سرخ دھبے تھے جو نیچے وادی میں اترتے چلے گئے تھے۔ ظاہر ہے دونوں میں سے ایک آدمی

زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے پاؤں یا پنڈلی پر گولی لگی ہوگی۔ جاوید کچھ دیر وہاں کھڑا خون کے جھے ہوئے

سرخ دھبوں کا مشاہدہ کرتا رہا۔

وہ اگر چاہتا تو بڑی آسانی سے ان لوگوں کا تعاقب کر سکتا تھا۔ خون کے دھبے اسے

ڈاکوؤں کی کہیں گاہ تک لے جاسکتے تھے۔ لیکن اس نے اس کی خاص ضرورت مسوں نہ کی۔ وہ آنا

سوچا کہ وہاں کوئی نہ تھا۔ یہ شخص اس کا وہم ہی تھا۔ وہ واپس میز سے اترنے ہی لگا تھا کہ اچانک دو

آدمی درختوں میں سے نمودار ہوئے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے۔ چاروں طرف گھور گھور کر

دیکھتے جاوید کی خواب گاہ والی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگے۔ جاوید ایک دم چونکا ہوا۔ تو گویا یہ

اس کا وہم نہیں تھا۔ یہ ضرور ڈاکو ہیں اور ڈاکو ڈالنے آئے ہیں ان میں سے ایک آدمی پیچھے کھڑا

رہا اور دوسرا جاوید کی خواب گاہ والی کھڑکی کے ساتھ لگ کر جھک کر اندر دیکھنے کی کوشش کرنے

لگا۔ پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے پیچھے والے ساتھی کو بلایا۔ اب دونوں کھڑکی کے ساتھ

جھک کر اندر دیکھنے لگے۔

پھر جاوید کو یوں لگا جیسے وہ کھڑکی کو کھولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب جاوید سے نہ رہا

گیا۔ اس نے آہستہ سے اپنی کھڑکی کی کنڈی اتار کر پٹ کھولا پستول کی تالی سلاخوں میں سے باہر

نکالی اور اس کا رخ ان آدمیوں کے پاؤں کی طرف کر کے یکے بعد دیگرے تین فائر کر دیئے۔

پہاڑی آدمی رات کی سنان خاموشی میں گولیوں کے چلنے کی آواز سے گونج

اٹھی۔ دونوں آدمی تڑپ کر اور اچھل کر ایک طرف گر پڑے۔ ایک آدمی بجلی کی تیزی کے ساتھ نیچے

بھاگا اور دوسرا برف پر پڑے پڑے نیچے پھسلنے لگا۔ دوسرے آدمی نے جب دیکھا کہ اس کا ساتھی

اٹھ نہیں سکتا۔ تو وہ اوپر آیا اور جلدی جلدی سے اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور نیچے پہاڑی کی تریٹ میں

کہیں گم ہو گیا۔

پستول کے فائروں کی آوازیں کرنفڈ کی بھی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے چونک کر ادھر

ادھر دیکھا۔ جاوید وہاں نہیں تھا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ جاوید بھاگ کر اس کے کمرے میں آیا اور وہ

اس کی چھاتی سے پٹ گئی۔

”ہائے یہ کیا ہوا تھا؟ پستول کہاں چلا تھا۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟“

جاوید نے اصل بات چھپاتے ہوئے اسے صرف اتنا ہی بتایا کہ کوئی جنگلی جانور باہر



۔۔ ان کی ٹیکسی کے پیچھے پیچھے آرہی ہے۔ ان کی ٹیکسی اگر کسی جگہ ٹھہرتی ہے تو جیب بھی ٹھہر جاتی ہے۔ ایک جگہ انہوں نے گاڑی کی رفتار کم کر دی تو جیب کی رفتار بھی وسمی پڑ گئی۔ جاوید نے اس جیب کے بارے میں کسی سے بات نہ کی نہ ڈرائیور سے اس کا ذکر کیا اور نہ نغمہ ہی سے کچھا کہا۔ وہ بڑی خاموشی سے اس کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتا رہا۔ کبھی کبھی وہ پیچھے گردن گھما کر دیکھ لیتا۔ جیب باقاعدہ ان کی گاڑی کا تعاقب کر رہی تھی۔

کمپنی باغ آ کر اس نے گاڑی رکوا دی۔

”تم بھی چائے وغیرہ پی لو ڈرائیور دس منٹ بعد چلیں گے۔“

جاوید نے دیکھا کہ وہ سبز رنگ کی جیب بھی ذرا پیچھے ایک جگہ رک گئی اور اس میں سے ایک آدمی نکل کر ہوٹل میں گھس گیا اور پھر چائے کی دو چھٹئیں اور پیالے لے کر واپس جیب میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس آدمی کی شکل جاوید کے لئے اجنبی تھی۔ جیب میں تین چار آدمی سوار تھے اور سوائے اس آدمی کے جو چائے لینے آیا تھا اور کوئی بھی باہر نہ نکلا۔

جاوید اور نغمہ ہوٹل کے اندر بیٹھ کر چائے پیتے رہے۔ چائے کے بعد وہ گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے اور ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔ جاوید نے دیکھ کر جیب بھی ان کے ساتھ ہی سٹارٹ ہو گئی تھی اور اس نے جاوید کی گاڑی کا تعاقب شروع کر دیا تھا۔ جاوید اب پوری طرح چوکس ہو گیا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ لوگ رات والے ڈاکو یا سینٹھ کے بھیجے ہوئے غنڈے ہی ہیں اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر تسلی کر لی کہ پستول اس کی جیب ہی میں تھا۔

کمپنی باغ سے آگے بڑی تیزی سے اترائی شروع ہو گئی اور سورج ہزارہ کی پہاڑیوں میں غروب ہونا شروع ہو گیا۔ جنگلوں اور پہاڑی ڈھلوانوں پر شام کے گہرے سبز اندھیرے منڈلانا شروع ہو گئے تھے۔

ٹرینٹ سے آگے جا کر اور پچھلے سے مٹی چھٹیل پیچھے سانول سے میں کے پار جا کر

مری سے واپس جا رہا تھا۔ اسے اس بک بک میں پڑنے کی کیا پڑی تھی؟  
”جاوید!“

اندر سے نغمہ نے آواز دی۔ جاوید اندر چلا گیا۔ ناشتے کے بعد گرم کپڑے پہن کر دونوں میاں بیوی کچھ چیزیں وغیرہ خریدنے نیچے لوڑ بازار میں آ گئے۔ لوڑ بازار مری کا دیہاتی بازار ہے اور مال روڈ سے اس کی حیثیت بالکل مختلف ہے۔ یہاں سے نغمہ نے چاندی کے جن اور بالیاں خریدیں۔ کچھ نوکریاں اور آرائشی چھاج خریدے۔ پردوں کے لئے ہاتھ سے بنا ہوا سفید کھدر خریدا۔ جاوید نے پوچھا۔

”اس کھدر کا کیا کرو گی۔“

”اس پر پھول پتے چھوڑ کر پردے بناؤں گی۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرا گھر تم پوری طرح سجاؤ گی۔“

”کیوں نہیں۔ اب وہ تمہارا ہی نہیں میرا گھر بھی ہو گا۔“

گھر آ کر انہوں نے کھانا کھایا اور ذرا سی دیر کے لئے آرام کرنے لیٹ گئے۔ چار بجے کے قریب ٹیکسی والے نے آ کر دروازے پر دستک دی۔

”صاحب گاڑی لے آیا ہوں۔“

”ٹھہر دو ذرا۔“

جاوید نے نغمہ کے ساتھ مل کر اپنا تھوڑا بہت سامان باندھا۔ ڈرائیور نے اسے اٹھا کر ٹیکسی میں رکھا۔ جاوید نے کالج کو تالا لگایا اور ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ ٹیکسی مری کی برف پوش مال روڈ پر سے گذر کر سنی بنک کی طرف آ گئی اور وہاں سے راولپنڈی کی جانب روانہ ہو گئی۔ پانسہ گلی سے نکل کر مہروی کم ہو گئی اور برف پوش درختوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔

رائے میں جاوید نے محسوس کیا کہ ایک سبز رنگ کی جیب گاڑی سنی بنک کے چوک

ڈرائیور نے کہا۔

”میرا خیال ہے صاحب کہ میں کسی آتی جاتی بس پر سوار ہو کر پنڈی جاتا ہوں اور آدھ گھنٹے میں پلگ لے کر واپس آ جاتا ہوں۔“

نغمہ نے ڈر کر کہا۔

”ہائے اللہ! میں تو ایک پل اس جنگل میں نہیں ٹھہر سکتی۔ رات سر پر آ رہی ہے۔“

ڈرائیور نے کہا۔

”پھر تو رو کوئی چارہ نہیں بیگم صاحبہ مجھے پنڈی جانا ہی پڑے گا۔“

اتنے میں میں ایک بس آ گئی۔ ڈرائیور نے اس بس کو ہاتھ دے کر روکا۔ بس رک گئی۔

ڈرائیور اس میں سوار ہو کر پنڈی روانہ ہو گیا۔ اب اس جنگل کے ویرانے میں جب کہ شام ہو رہی تھی نغمہ اور جاوید اکیلے رہ گئے۔ جاوید پستول والی جیب میں ہاتھ ڈالے کچھ دیر باہر کھڑا سگریٹ پیتا رہا۔ نغمہ نے اسے اندر آ جانے کو کہا بھی مگر وہ باہر ہی کھڑا رہا۔ دراصل وہ ڈیڑھ فرلانگ پر کھڑی ہنرنگ کی جیپ سڑک سے ہٹ کر کھڑی تھی اور سارے لوگ اندر بیٹھے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی خاص سنگل یا خاص وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ سورج پہاڑیوں کے عقب میں غروب ہو گیا اور شام کے سائے گہرے ہونا شروع ہو گئے۔ سردی بڑھ گئی اور سڑک کے آس پاس ہلکا ہلکا اندھیرا چھانے لگا۔ نغمہ نے آواز دی۔

”خدا کے لئے آپ اندر آ کر بیٹھ جائیں۔ کہیں سے جنگلی جانور نہ نکل

آئے اندر آ جائیں۔ ہم سارے شیشے چڑھالیتے ہیں۔“

جاوید نے اندر نہ کر کے کہا۔

”فکر نہ کرو میری جان! یہاں کوئی جنگلی جانور نہیں ہوتا۔ میں تمہارے

گاڑی اچانک خراب ہو گئی۔ ڈرائیور نے دو تین بار سلف بایا۔ انجن گزر گزر کر کے خاموش ہو گیا۔

”پٹرول ختم تو نہیں ہو گیا ڈرائیور؟“

”نہیں صاحب پٹرول تو ٹینکی میں بھرا ہوا ہے۔“

”پھر کیا ہو گیا؟ میں دیکھتا ہوں انجن کو۔“

جاوید نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ڈرائیور فوراً سمجھ گیا کہ صاحب کاڑی چلائی جاتا ہے اور انجن کی مشین سے واقف ہے۔ اس نے بونٹ اٹھاتے ہی انجن میں سے ایک پلگ نکال کر کوٹ کی جیب میں ڈال لیا اور پھر حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اب جاوید بھی اس کے پاس آ کر انجن پر جھکا کھڑا تھا۔

”کیا خرابی پیدا ہو گئی اس میں؟“

”صاحب ایک پلگ غائب ہے۔ کہیں گر گیا۔“

”پلگ اگر گرا بھی ہوگا اندر مشین میں ہی ہوگا۔“

”اسے ہی دیکھ رہا ہوں صاحب۔“

ڈرائیور نے جھوٹ جھوٹ پلگ کی تلاش شروع کر دی۔ معلوم ہوا کہ یہ ڈرائیور بھی ان ڈاکوؤں یا سیٹھ کے غنڈوں کا آدمی تھا جو جیپ میں بیٹھے ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ جاوید نے پیچھے دیکھا کوئی ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر جیپ کھڑی ہو گئی تھی۔

”اب پلگ کہاں سے آئے گا؟“

ڈرائیور نے بناوٹی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”بڑی مشکل آ گئی ہے صاحب۔ پلگ تو اب پنڈی سے ہی مل سکے گا۔“

نغمہ سراسیمہ ہو گئی۔

”اب کیا ہوگا جاوید۔ شام ہو گئی ہے اور ہم یہاں کہاں بیٹھے رہیں گے؟“



”کیا اس بندہ کو کئے اور لوگ ہیں یہیں ہوں۔“ مجھے ڈرائیور ملتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ سائونل پل کے پاس وہ انہیں چھوڑ کر آ رہا ہے۔“

جاوید سمجھ گیا کہ وہ نیکی ڈرائیور بھی ان کا ہی آدمی تھا۔ اس نے نعرہ کو ساتھ لیا اور اندھیرے میں ہی کھڑکی خطرناک اترائی اترنے لگا۔ اتنے میں اوپر سے ان لوگوں نے جیپ اور کاریں سڑک کے کنارے کھڑی کر کے نیچے ان کی فل لائٹ بھینگی۔ کھڑو ز روشن کی طرح چمک اٹھی۔ انہوں نے جاوید اور نعرہ کو دیکھ کر یکے بعد دیگرے دو فائر کئے۔ جاوید نے بھی پستول سے اوپر فائرنگ شروع کر دی۔ اب دونوں جانب سے گولیاں چلنے لگیں۔ جاوید کے پاس گولیاں ختم ہو گئیں۔ جب اوھر سے کوئی فائر نہ ہوا تو ان ڈاکوؤں نے نیچے اترنا شروع کر دیا اور جاوید اور نعرہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کھڑکی خطرناک تھی۔ نعرہ کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ قریب قریب بے ہوش ہونے کو تھی۔

جاوید کو زیادہ وقت اسے سنبھالنے میں صرف ہو رہا تھا۔ اتنے میں ان ڈاکوؤں نے دونوں کو اپنے نرغے میں لے لیا اور پستول کی نالیاں ان کے سروں سے لگا کر انہیں اوپر چلنے کو کہا اور پھر پشتو زبان میں آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگے۔ جاوید ان کے حکم کی تعمیل پر مجبور ہو گیا۔ انہوں نے جاوید اور نعرہ کی آنکھوں پر سیاہ پٹیاں باندھیں اور جیپ میں بٹھلا کر پنڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔

سامنے ہی باہر کھڑا ہوا۔ یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ ڈرائیور بس اب آ ہی رہا ہوگا۔ پنڈی یہاں سے بہت نزدیک ہے۔“

لیکن جاوید کو ابھی طرح معلوم تھا کہ خطرہ ان کے سروں پر منڈا رہا ہے اور ابھی کچھ دیر میں جب اندھیرا ہو جائے گا کچھ نہ کچھ وقوع پذیر ہونے کو ہے۔ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا مگر نہ ڈرائیور ہی واپس آیا نہ سبز رنگ کی جیپ نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ اندھیرا اب پوری طرح چھا گیا اور جب جیپ نظر آتا بند ہو گئی۔ اتنے میں اچانک جاوید نے فضا میں پستول کی فائر کی آواز سنی نعرہ نے کانپ کر کہا۔

”یہ تو گولی کی آواز ہے۔“

جاوید اب اندر اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے گولی کی آواز کے ساتھ ہی پیچھے کی جانب جیپ کی شارٹ ہونے کی آواز سنی۔ اس نے جلدی سے نعرہ کو ساتھ لیا اور دروازہ کھول کر اس کے ساتھ ہی باہر نکلا اور تیزی سے نیچے کھڑکی ڈھلان میں اتر گیا۔

”ہائے اللہ! یہ کیا ہو رہا ہے۔“

”خاموش رہو نعرہ۔ خاموش رہو اور حوصلہ نہ ہارو۔“

اسی دم جیپ کی تیز روشنی نمودار ہوئی اور وہ بڑی تیزی سے نیکی کے پاس آ کر ایک دم رک گئی۔ تین چار آدمی اس میں سے کود کر اترے اور انہوں نے نیکی کی تلاشی لینی شروع کر دی۔

”یہاں کوئی نہیں اٹاؤ۔“

جاوید نے دیکھا کہ پنڈی کی جانب سے دو کاریں بھی آ کر وہاں کھڑی ہو گئیں اور کچھ لوگ ان میں سے بھی اتر کر ان ڈاکوؤں میں شریک ہو گئے۔

”کہاں ہے مال؟“

”غائب ہو گیا بچا۔“

میں اور اس نے بھی ایک بار کشتی کا سفر کیا۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ لوگ ان دونوں کو الگ الگ گاڑیوں میں اپنے ساتھ سفر کر رہے تھے اور براستہ سرگودھا ملتان اور حیدر آباد سڑک پر سے کراچی وارڈ ہوئے تھے۔ وہ ریل گاڑی اور ہوائی جہاز کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ نغمہ کی آنکھوں سے جب پنی اتری تو اس نے دیکھا کہ وہ وہاں سینٹھ کی اسی کوئی میں تھی جہاں سے اس نے ہمیں بدل کر راہ فرار اختیار کی تھی۔ وہ کمرے میں چٹنگ پر بیٹھ گئی اور واقعات کی ستم ظریفی پر غور کرنے لگی۔ کتنے مزے میں انہوں نے مری میں دن بسر کئے تھے اور اچانک یہ کیسی مصیبت ان پر ٹوٹ پڑی تھی۔ اسنے میں دروازہ کھلا اور اس کی ماں اندر داخل ہوئی۔

نغمہ نے اپنی ماں کو دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ جھممو بائی نے آتے ہی نغمہ کو لعن طعن شروع کر دی۔

”تم نے مجھے ذلیل کر کے چھوڑا ہے۔ میری سینٹھ کے آگے ایک پیسے کی عزت نہیں رہ گئی۔“  
نغمہ نے جل کر کہا۔

”تو میں کیا کروں؟ میں نے کہا تھا کہ میری شادی یہیں کر دیں۔ میں نے سینٹھ سے شادی کرنے کے لئے آپ کے ہاتھ پاؤں پکڑے تھے کیا؟ میں نہ کہتی تھی کہ میری شادی یہاں نہ کریں۔ میں یہاں ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ پھر آپ نے ایسا کیوں کیا۔ اب آپ لوگ کئے کی سزا بھگتیں۔“

”بکواس بند کر حرامہادی نہیں تو میں تیری زبان کھینچ لوں گی۔ تیری یہ مجال کہ ماں کے آگے زبان درازی کر رہی ہے۔“

”تم میری ماں نہیں ہو۔ اگر ماں ہوتیں تو اپنی بیٹی کے دام نہ وصول

اس کے بعد جاوید کو باکل معلوم نہ ہو۔ کاکہ نغمہ کب اس سے جدا ہو گئی اور اسے وہ لوگ کہاں کہاں لئے پھرتے رہے۔ اتنا اسے معلوم ہے کہ کبھی وہ کار میں سوار ہوا اور کبھی ٹرک میں۔ ایک بار اس نے ان لوگوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر دریا بھی عبور کیا۔ وہ چھ روز اور سات راتیں ان لوگوں کے ساتھ رہا۔ نغمہ کا اسے بالکل علم نہ ہو سکا کہ وہ کب اس سے جدا کر دی گئی اور کہاں چلی گئی۔ اس کی آنکھوں سے جب پنی کھلی تو وہ کراچی شہر سے باہر ساحل سمندر کے ایک ویران سے بنگلے کے ایک کمرے میں تھا۔ جس کی سلاخوں کے باہر سے سمندر کی لہریں اور ساحل کی ریت نظر آ رہی تھی۔ اسی کمرے میں اسے کھانا وغیرہ پہنچا دیا جاتا۔ وہاں سے باہر نکلنے کی ندا سے اجازت تھی اور نہ کوئی راستہ ہی باہر کو جاتا تھا۔ دروازہ چوبیس گھنٹے باہر سے مقفل رہتا۔ جاوید کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ سینٹھ کے کرایہ پر حاصل کئے گئے غنڈے ہیں اور نغمہ کو انہوں نے سینٹھ کے پاس پہنچا دیا ہے۔ اس کے پاس جو چھ سات سو روپے بچے تھے ان لوگوں نے سامان اور نغمہ کے زیورات کے ساتھ وہ بھی چھین لئے تھے۔

نغمہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اسے بھی نہیں معلوم کہ کب وہ جاوید سے جدا ہو گئی اور کہاں کہاں سے ہو کر وہ سفر کرتی رہی۔ وہ بھی کبھی کار میں سوار ہوئی۔ کبھی جیپ میں اور کبھی ٹرک



کر تم۔ تم مجھے اپنے ہاتھوں جہنم میں دھکا نہ دیتیں۔ تم میری ماں نہیں ہو۔ مجھے تم کو ماں کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔“

مجھو بائی نے زور سے نغہ کے سر پر ایک تھپڑ مار دیا۔ نغہ نے اپنا سر بازوؤں میں چھپایا اور سسکیاں لے لے کر زار و قطار رونے لگی۔ مجھو بائی جوتا اتار کر اسے مارنے ہی لگی تھی کہ پیچھے سے علی اکبر نے بلند آواز سے کہا۔

”خبردار شیم! ہاتھ اوپر ہی رکھنا۔“

اپنا پرانا نام شیم سن کر مجھو بائی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں اس کا سابق شوہر اور نغہ کا باپ علی اکبر کھڑا تھا۔ مجھو تو بت بنی اسے دیکھتے ہی رہ گئی۔ علی اکبر نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”بہتر ہو کہ یہ جوتا تم نغہ کے سر پر مارنے کی بجائے اپنے منہ پر مار لو۔ کیونکہ تمہارا چہرہ اسی لائق ہے کہ اس پر جوتے برسائے جائیں۔ میری بیٹی نے ٹھیک کہا ہے کہ تم اس کی ماں نہیں ہو۔ اگر ماں ہو تیں تو اس کی عصمت کی بولی نہ اٹھاتیں اس کا سینہ کے پاس سودا نہ چکا تیں۔“

مجھو بائی تو علی اکبر کو وہاں اچانک دیکھ کر ابھی تک گم سم سی کھڑی تھی۔ نغہ اب اٹھ کر باپ کے سینے سے لگ گئی تھی اور علی اکبر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا اس نے کہا۔

”میری طرف غور سے کیوں دیکھ رہی ہو شیم؟ میں علی اکبر ہوں۔ تمہارا

سابقہ شوہر۔ جس کو تم نے دھوکا دے کر غیر مرد سے رنگ رلیاں منایا

کرتی تھیں اور جس نے تمہیں اسی مرد کے حوالے کر کے طلاق دے دی

تھی اور اپنی مردانگی کا ثبوت دیا تھا اور جس کی اکلوتی بیٹی نغہ کو تم نے اپنے

داللوں کے ذریعے کارخانے کے باہر سے اغوا کر لیا تھا۔ لیکن خدا نے

مجھے میری بیٹی مجھے واپس کر دی مگر تمہیں تمہاری کھوئی ہوئی عزت واپس

نہ مل سکی۔ سنایا اب تم نے مجھے پہچان لیا ہے۔ میں بوڑھا ہو گیا ہوں لیکن

تمہاری طرح منکوس نہیں ہوا۔ تم بڑھی بھی ہو گئی ہو اور تمہارے چہرے پر نحوست بھی برسے لگی ہے۔ میرے بال سفید ہوئے ہیں مگر روح اس سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے تمہارے بال ہی سفید نہیں ہوئے خون بھی سفید ہو گیا ہے۔“

مجھو بائی نے نفرت سے سر بلند کیا اور کہا۔

”مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ میری بیٹی کو اس کیسے لڑکے کے ساتھ بھگانے میں کس کا ہاتھ تھا۔ میں سینٹھ سے کہہ کر تمہیں صرف نوکری سے ہی جواب نہیں دلواتی بلکہ حوالات میں بھی پہنچاتی ہوں۔ کیونکہ تم نے میری بیٹی کو نہیں بلکہ سینٹھ کی منکوحہ بیوی کو اغوا کروایا تھا۔“

علی اکبر نے حقارت سے ہنس کر کہا۔

”نہ مجھے نوکری کی پرواہ ہے اور نہ میں حوالات جانے سے ڈرتا ہوں سچائی کی خاطر اور اپنی بیٹی نغہ کی خوشی کے لئے حوالات تو کیا اگر مجھے پھانسی کے تختے پر بھی چڑھنا پڑے تو میں ہنسی خوشی چڑھ جاؤں گا۔“

اتنے میں پرویز اور سینٹھ اندر داخل ہوئے۔ سینٹھ نے غصے میں کہا۔

”یہ کیا ہو۔ ہاے علی اکبر؟ تم یہاں کیسے آ گئے؟“

مجھو بائی نے کہا۔

”اے گرفتار رلیں سینٹھ صاحب یہ شخص اپنے آپ کو نغہ کا باپ بتاتا ہے

اور اسی نے آپ کی بیوی کو اس کوٹھی سے فرار ہونے میں مدد دی تھی۔

جاوید کے ساتھ اسی نے نغہ کو بھگا دیا تھا۔“

سینٹھ نے خون آلود آنکھوں سے علی اکبر کو دیکھا اور ایک دھکا مار کر کہا۔

کر رکھی ہے اب میں آپ کو ماہانہ دو ہزار کی قسط بھی ادا نہیں کروں گا۔  
مجمو بائی کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔  
”خدا کے لئے ایسا نہ کریں سینھ صاحب! ہم تو خاک میں مل جائیں گے۔  
عزت الگ گئی۔ لڑکی الگ ہاتھ سے گئی اب آ۔ ہماری زندگی کا آخری  
سہارا ہوا خرچ بھی بند کر رہے ہیں۔“  
پرویز نے کہا۔

”سینھ صاحب یہ زیادتی ہوگی۔ دو ہزار نہ سہی کم از کم ایک ہزار روپیہ مہینہ  
توا دیا کرو یا کریں۔“  
سینھ نے سرائھا کر کہا۔

”بہت اچھا میں ایک ہزار روپیہ مہینہ صرف ایک سال تک ادا کروں گا۔  
پھر پانچ سو روپے ماہوار مجمو بائی کی تا عمر پنشن مقرر کر دوں گا۔ یہ میں نے  
صرف آپ لوگوں کے بڑھاپے میں ترس کھا کر کیا ہے۔ ورنہ اس شادی  
نے مجھے بے حد ذہنی، مالی اور خاندانی نقصان پہنچایا ہے۔“

سینھ نے ایک ہزار روپے کی پہلی قسط مجمو بائی اور پرویز کو ادا کر دی اور انہیں رخصت  
کر دیا۔ خود دفتر ضروری کام سے چلا گیا۔ نفوذ کو سخت پہرے میں قید کر دیا تھا۔ اس کے کمرے میں  
اب چڑیا بھی بغیر اجازت کے نہ جاسکتی تھی۔

علی اکبر سینھ کی کونٹھی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر باہر نکلا اور بس میں سوار ہو کر سیدھا  
محسٹریٹ احمد کے ہاں پہنچا۔ وہاں جا کر اس نے پوری کہانی سنائی اور کہا۔  
”نفوذ! پس سینھ کے پاس آگئی ہے مگر جاوید کا کچھ علم نہیں۔“  
احمد صاحب نے کہا۔

”کیوں بے نمک، حرام بندھے! تیری یہ مجال کہ میری بی بی کو یہاں سے  
بھگا دے؟ نکل جا اس گھر سے ابھی۔ اسی وقت۔۔۔ نہیں تو  
میں تیری کھال کھینچ کر کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔“

سینھ نے علی اکبر کو دھکے مار کر کمرے سے باہر نکال دیا۔ نفوذ روتی ہوئی ”ابا جان، ابا  
جان“ پکارتی اس کی طرف بڑھی سینھ نے اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا اور اسے کھینچ کر چنگ پر  
گرا دیا۔

”کینی عورت! ارذیل ڈرائیور کو باپ بنا بیٹھی تو نے میری بی بی بن کر  
میری عزت کو بدنام کرنا چاہا تھا۔ میرے خاندان کے وقار کو گندی نالی میں  
ڈبو دینے کی کوشش کی تھی۔ میں تم سے اس کا بدلہ لوں گا۔ اب تمہیں اس گھر  
میں لوٹنی بن کر رہنا ہوگا۔ پہلے تم اس گھر کی مہارانی تھیں اب تمہاری  
حیثیت نوکرانوں سے بھی بدتر ہوگی۔“

مجمو بائی نے سینھ کی ہاں میں ہاں ملا کر کہا۔  
”آپ اس سے جتنا بڑا ابھی سلوک کریں کم ہے۔ یہ حرامزادی اسی سلوک  
کی حق دار ہے۔ اس نے آپ کے ساتھ ہمیں بھی ذلیل کیا ہے۔“  
”بالکل درست ہے۔“

پرویز نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ اس کے بعد وہ لوگ وہاں سے باہر آ گئے  
سینھ نے مجمو بائی سے کہا۔

”مجمو بائی! میں نے بڑی مشکل سے اس لڑکی کو دوبارہ حاصل کیا ہے۔  
میرا اس کی واپسی پر کوئی چھ سات ہزار روپیہ خرچ ہو گیا۔ میں تم لوگوں کو  
اب ایک پانچواں بھی ادا نہیں کروں گا۔ گاڑی اور کونٹھی میں نے پہلے ہی ضبط



”جاوید صبح کا واپس آ چکا ہے۔ اسو رہا ہے کچھ لوگ اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر رات کے پچھلے پہر صدر بازار کے چوک میں چھوڑ گئے تھے۔“  
علی اکبر نے کہا۔

”خدا کا شکر ہے کہ وہ بھی واپس آ گیا۔“

احمد نے کہا۔

”مگر علی اکبر! اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ایک تو یہ بات ہے کہ جاوید اور نفہ کی شادی نا جائز اور غیر قانونی تھی۔ انہوں نے راولپنڈی کی عدالت میں جو سینٹھ سے طلاق لینے کا دعویٰ دائر کیا تھا وہ غلط نام سے تھا اور غلط نام ہی سے انہوں نے عدالت سے اشتہار دلوا لیا تھا۔ یہ تو ان ان دونوں پر عدالت کو دھوکا دینے کا مقدمہ چل سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سینٹھ اور نفہ اس وقت باقاعدہ میاں بیوی ہیں۔ قانون یا میں اور تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

علی اکبر اپنے دوست کی بات بڑے غور سے سنتا رہا۔ پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور سر جھکا کر سوچ میں گم ہو گیا احمد نے کہا۔

”اب تو ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔ شاید نفہ سے سینٹھ کی زیادہ نہ بچھ سکے۔ اور وہ اسے طلاق دیدے۔ اس کے بعد ہی جاوید سے اس کی شادی ہو سکتی ہے۔ یا پھر نفہ کی جانب سے عدالت میں طلاق حاصل کرنے کی درخواست دلوائی جائے اور اس کی باقاعدہ پیروی ہو وکیل مقدمہ لڑے۔ تو اول تو نفہ سے ملنا اور اس سے درخواست دلوانا مشکل کام ہے۔ پھر یہ دیوانی مقدمہ ہوگا ہو سکتا ہے چھ ماہ تک چلے۔ ایک برس تک چلتا

جائے۔ سینٹھ روپے والا بااثر آدمی ہے۔ وہ اسے بہت دیر تک کھینچ سکتا ہے۔ ویسے بھی سینٹھ کے گھر میں رہ کر وہ ایسا مقدمہ دائر نہیں کر سکتی اور اس کے گھر سے باہر اسے کوئی نکال نہیں سکتا۔ یہ اصل مشکلات ہیں۔ اس پر غور کر لو۔“

علی اکبر نے سر اٹھا کر کہا۔

”بہت اچھا میں غور کروں گا۔ تم بھی غور کرنا۔ اب اجازت دو۔ سینٹھ انتظار کر رہا ہوگا۔“

شام ہو گئی ہے کھانا کھا کر جانا۔“

”شکر یہ دوست! مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔“

علی اکبر نے اپنے دوست کو یہ نہیں بتایا تھا کہ سینٹھ نے اسے نوکری سے جواب دے دیا ہے۔ علی اکبر وہاں سے نکل کر سید حاصد کے ایک ہوٹل میں جا کر کونے میں چائے کی پیالی لے کر بیٹھ گیا۔ اسے خیال آیا کہ آج سے سولہ سترہ برس پہلے وہ اسی طرح ایک شام لاہور کے ہوٹل میں چائے کی پیالی سامنے رکھ کر بیٹھا تھا اور اپنی طوائف بیوی کی بے وفائی پر سوچ رہا تھا۔ آج وہ اپنی بیٹی کی بد نصیبی پر آنسو بہا رہا تھا۔ اچانک اس نے سوچا کہ اس کی بد نصیبی کا اصل باعث اس کی ماں جھمو بائی یعنی شیم ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ علی اکبر کی ساری زندگی تباہ و برباد ہو جائے۔ اس کی بیٹی عمر بھر کے لیے جہنم میں گر جائے اور اس کی سابقہ بیوی جھمو بائی گھر بیٹھے سینٹھ سے ماہوار ہزاروں روپے وصول کر کے عیش کرتی رہے۔ علی اکبر اس خیال کے ساتھ ہی اٹھا چائے کے پیسے ہوٹل کے کاؤنٹر پر ادا کئے اور باہر سڑک پر نکل آیا۔

اب رات ہو چکی تھی اور کراچی کے صدر بازار میں بڑی چہل پہل تھی۔ موٹریں گھز رہی تھیں۔ لوگ بڑی تیزی سے شاہراہوں پر جا رہے تھے۔ علی اکبر نے ایک واقعہ

کمرے میں آ رہی تھی۔ علی اکبر دبے پاؤں آہستہ آہستہ اس دروازے کی طرف بڑھا۔ کھلے دروازے کے ساتھ سرنگا کر اس نے جھانک کر اندر کا نقشہ دیکھا۔ جھمو بائی بالکل عریاں ہو کر پلنگ پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ پرویز بھی نیم عریاں حالت میں قالین پر بے ہوش پڑا تھا۔ ایک گلاس ٹونا پڑا تھا۔ شراب کی بوتل اوندھی ہو کر گری ہوئی تھی۔ ایش نرے میں ایک سگریٹ آدھے سے زیادہ جل کر سلگ رہا تھا۔ علی اکبر کو یوں محسوس ہوا جیسے جھمو اس کی بیوی ہے اور وہ اس کی عدم موجودگی میں کسی غیر مرد سے زنا کاریوں میں مشغول ہے۔ اس کا خون کھول اٹھا۔ وہ کمرے میں آ کر پلنگ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑے غور سے جھمو بائی کی تنگی پیٹھ کو دیکھا۔

پھر قمیض کے اندر ہاتھ ڈالا۔ برف توڑنے والا خونخوار لمبا سوا نکالا۔ اس کی نوک اندازہ لگا کر بے ہوش جھمو کی تنگی پشت پر دل کے پاس رکھی اور ایک لرزہ خیز جھٹکے کے ساتھ دونوں ہاتھوں کے دباؤ سے سوا جھمو بائی کے سینے میں گھیسڑ دیا۔ ہلکی سی اندھ ہٹاک چیخ بلند ہوئی۔ جھمو بائی کا جسم دو تین بار لرزہ، کانپا، تھر تھرایا، تڑپا، سیدھا ہوا، خون کا فوارہ دل کے پاس سے جاری ہو گیا۔ علی اکبر نے دوسری بار پھر سینے میں دل کے پاس سوئے کا بھر پور وار کیا۔ ہلکی سی چیخ پھر بلند ہوئی۔ جھمو بائی کا ننگا بدن خون میں لت پت ہو گیا۔

وہ تیز ہوا میں ٹنٹو پر لگے خشک پتے کی مانند کانپنے اور لرزے لگا۔ اور پھر ٹھنڈا پڑ گیا۔ علی اکبر ایک سنگدل قاتل کی طرح یہ سارا منظر وہاں کھڑا دیکھتا رہا جب جھمو بائی کی لاش ٹھنڈی پڑ گئی۔ تو اس نے پلنگ کی چادر سے خون آلود سوئے کو اور اپنے ہاتھوں کو اچھی طرح سے صاف کیا۔ اگلیوں پر بٹے ہوئے انسانی خون کو پونچھتا گل کی چپکے سے باہر نکل آیا کوٹھی سے باہر نکل کر وہ شہر کی طرف چل پڑا۔ شہر میں آتے ہوئے راستے میں ہی اسے ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ اس نے ہاتھ دے کر ٹیکسی کو روکا۔ اس میں سوار ہوا اور آخری حساب صاف کرنے کے لئے سینے کی کوٹھی کی طرف

کار کی دکان سے برف توڑنے والا بڑا سوا نکالا۔ اسے اپنی قمیض کے اندر چھپایا اور ٹیکسی میں سوار ہو کر جھمو بائی کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ کوٹھی کے باہر پہنچ کر وہ ٹاریل کے درختوں میں چھپ کر بیٹھ گیا اور رات گہری ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

جھمو بائی اور پرویز کو آج دیر بعد ہزار روپیہ ملا تھا۔ اور وہ کوٹھی میں اکیلے تھے۔ ہر بات طے ہو گئی تھی۔ لڑکی واپس سینے کو مل چکی تھی۔ وہ دونوں آج بڑے خوش تھے۔ انہوں نے شراب کی بوتل خریدی اور کمرے میں آ کر شغل بادہ نوشی کرنے لگے۔ کوٹھی میں سوائے ان کے اور کوئی نہیں تھا۔ نوکر ایک ہی تھا جو باورچی خانے کے باہر پرلی جانب سو گیا تھا۔ جھمو بائی نے شراب کے جام بھر بھر کر پرویز کو پلائے اور خود بھی پئے۔ پھر وہ تان پورہ لے کر بیٹھ گئی اور ٹھمری کا نا شروع کر دی۔ پرویز نشے میں تھا وہ یونہی ہاتھ ہلا ہلا کر اسے داد دینے لگا۔

”جیو جھمو جی جیو!“

پھر اچانک جھمو بائی نے تان پورہ پرے پھینک دیا اور شراب سے لبریز ایک گلاس حلق میں اتار لیا۔ پرویز نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ دونوں کو شراب چڑھ گئی۔ وہ نشے میں ڈھت ہو گئے۔ جھمو بائی نے اپنے سارے کپڑے اتار دیئے اور اپنا اذہیز عمر کا ڈھلکا ہوا بدن لے کر پلنگ پر اوندھے منہ پڑ گئی۔ پرویز اٹھا اور اس کی طرف لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے بڑھا۔ لیکن پلنگ کے پاس پہنچ کر چکر ایا اور قالین پر گر پڑا اور بیہوش ہو گیا۔

جھمو بائی کو بالکل ہوش نہ تھا۔ وہ بھی بے سدھ ہو کر پڑی تھی۔ ٹھیک اس وقت علی اکبر جھماڑیوں کے پیچھے سے نمودار ہوا اور لپک کر کوٹھی کے گیت میں سے گزرا اور برآمدے میں آ گیا۔ وہ اس کوٹھی میں سینے کو لے کر کئی بار آیا تھا۔ اسے تمام کمروں کا بخوبی علم تھا۔ اس نے عقبی دروازے سے روشندان میں ہاتھ ڈال کر پچھنی کھول دی اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کمرے میں اندھیرا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ دروازے کا آدھا پٹ کھلا تھا اور اندر سے روشنی اس



سینھ کو آگ لگ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر نغہ کو ہنروں سے دھڑا دھڑا کوٹنا شروع کر دیا۔ نغہ کے جسم سے خون بہنے لگا۔ وہ روتی رہی اور بار بار جاوید اور اپنے باپ کو پکارتی رہی۔

”ذلیل عورت! میرے سامنے اس اپنے یار کو آوازیں دیتی ہے۔ خاوند کے سامنے ایسا کرتی ہے۔ میں اس کا پورا پورا مزہ چکھ کر چھوڑوں گا۔“

سینھ نے ہنر ہاتھ میں اچھی طرح پکڑا اور نشے میں لڑکھڑاتا پیچھے دروازے کی طرف ہٹا تھا کہ پوری طاقت سے نغہ پر حملہ آور ہو۔ وہ دروازے کی طرف پیٹھ کئے کھڑا تھا۔ آلود نظروں سے نغہ کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے علی اکبر نے لمبا خونخوار سوا اس کے سینے میں گچ سے گھیسوا دیا جو اس کی پسلیوں سے ٹکراتا سیدھا سینھ کے دل میں پھوست ہو گیا اور وہاں سے پار ہو کر سینے سے باہر نکل آیا۔ سینھ کا جسم بید مجنوں کی شاخ کی طرح لرزا اور دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ اس کی آنکھیں دیکھے دیکھتے پتھر انگلیں اور بدن بے حس ہو کر مردہ ہو گیا۔ نغہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

خون ایک ایک دھار نکل کر قالین پر بہنے لگی۔ علی اکبر نے چادر نغہ کی طرف پھینکی۔

”اسے اوڑھ لو بیٹی! آج میں نے تمہاری زندگی کو تارکیوں سے ہمیشہ کے لئے پاک کر دیا ہے۔ میں تمہارے راستے کے سب سے بڑے پتھر اٹھا کر گہری کھد میں گرا دئے ہیں۔“

نغہ چیخ مار کر باپ سے لپٹ گئی۔

”ابا جان! یہ آپ نے کیا کر دیا“

”میں نے اپنے بچی کی زندگی۔۔۔ اس کے مستقبل اور اس کی مسرتوں کے لئے ایسا کیا ہے بیٹی! اب تم آزاد ہو اور جاوید سے دوبارہ شادی کر سکتی ہو اب کوئی چھمو بائی، کوئی سینھ تمہارے راستے میں رکاوٹ

روانہ ہو گیا۔

وہ رات علی اکبر کی بیٹی بد نصیب نغہ پر قیامت بن کر گذر رہی تھی۔

سینھ نے پہلے تو اسے ہنروں سے خوب چٹا تھا اور پھر اسے بالکل عریاں کر کے شراب کھول کر سامنے بیٹھ گیا تھا اور اسے شراب کا گلاس ہاتھ میں لے کر قفس کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ نغہ کی حالت بے حد خراب ہو رہی تھی۔ اس کے سارے بدن پر نسل پڑ چکے تھے۔ انگ انگ دروگر رہا تھا۔ پھر وہ بالکل عریاں تھی اور اس کے پیٹ میں جاوید کا ننھا سا بچہ بھی تھا۔ وہ کبھی اپنے جسم کو چھپاتی اور کبھی سینھ کے ہنر کی ضرب سے اپنے آپ کو بچاتی۔ سینھ شراب کا گلاس چڑھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور لڑکھڑا کر نغہ کی طرف بڑھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس نے اسے چکر دیا۔

”ناچو! ناچو! میں دیکھتا ہوں تم کس طرح نہیں ناچتی ہو۔“

پھر اس نے ہنر اٹھا کر ہوا میں لہرایا۔

”تم نکلے نکلے کے آدمیوں کے سامنے بے حیائی سے ناچتی رہی ہو۔“

میرے سامنے تمہیں ناچتے ہوئے شرم کیوں آ رہی ہے؟ کیا میں تمہارا خاوند نہیں ہوں۔ کیا اس لیے کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو؟“

نغہ نے تڑپ کر کہا۔

”ہاں میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ میں تمہاری صورت پر تھوکتی بھی نہیں تم

میرے جسم کے کھڑے کھڑے کر سکتے ہو۔ لیکن میری محبت کا ایک حقیر سا

کھڑا بھی حاصل نہیں کر سکتے۔“

”کیونکہ تم جاوید سے۔۔۔ اس کتے سے محبت کرتی ہو۔“

”ہاں میں اس سے محبت کرتی ہوں کتے تم ہو۔ وہ شیر ہے شیر ہے۔“

پیردی کی۔ سارا خرچ خود اٹھایا۔ اور اعلیٰ سے اعلیٰ وکیل کی خدمات حاصل کر کے علی اکبر کو بچانے کی سر توڑ کوشش کی مگر ناکام رہا۔ عدالت نے ڈیڑھ ایک سال کی قانونی کارروائی دیکھنے اور سننے کے بعد علی اکبر کو جس دوام یعنی عمر قید کی سزا سنائی۔ علی اکبر کے دوست نے اپیل کی اور علی اکبر کی سزا چودہ سال سے کم کر کے آٹھ سال کر دی گئی۔

علی اکبر کو جیل بھیج دیا گیا۔ نذر اور جاوید نے باقاعدہ شادی کر لی تھی۔ اور اب ان کے ہاں ایک ننھا سا بچہ بھی پیدا ہو چکا تھا۔ جو ایک سال کا تھا۔ وہ دونوں احمد صاحب کے ساتھ بچے کو لے کر علی اکبر کو ملنے جیل گئے۔ علی اکبر کا چہرہ کمزور ہو گیا تھا۔ رہے سبے بال بھی سفید ہو گئے تھے۔ مگر اس کی آنکھوں میں سکون اور اطمینان کی چمک تھی۔ جاوید، نذر اپنے دوست اور اپنے ننھے منے پوتے کو دیکھ کر وہ خوشی سے مسکرایا۔ اس نے پوتے کو گود میں اٹھا کر بے حد پیار کیا۔ اس کا ماتھا چوما اور احمد سے کہا۔

”میں اس کا نام احمد جاوید اکبر تجویز کرتا ہوں۔ کیوں یہ نام ہم تینوں کی محبت اور دوستی کو سلامت رکھے گا۔“

پھر اس نے نذر کو گلے لگا کر پیار کیا اور کہا۔

”بہنی آٹھ سال یوں گذر جائیں گے اور میں واپس گھر آ کر تمہارے بچوں سے کھیل کروں گا۔ اپنے خاوند، ساس اور سر کی خدمت کرنا۔ اب یہی تمہارے ماں باپ ہیں۔“

پھر اس نے جاوید کو بھی پیار کیا اور کہا۔

”یاد رکھو بیٹا! نیک نیت اور نیک دل انسان خواہ وہ جیل میں بھی رہے وہ کبھی دکھی نہیں رہتا اور بد ضمیر بدنیت انسان اگر کم خواب کے بستر پر بھی ہو

نہیں بن سکتا۔ تم آزاد ہو۔ تم آزاد ہو۔ تم آزاد ہو۔“

نذر من ہو کر رہ گئی تھی۔ اب نہ تو اس کے حلق سے کوئی چیخ بلند ہو رہی تھی۔ اور نہ ہی آنکھوں میں آنسو تھے۔ علی اکبر قہقہے لگا تا لاش کے گرد چکر لگانے لگا اور مردہ سینھ کے سینے میں ہار بار سوائے مارنے لگا۔ نذر نے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا مگر پاگل باپ کا ہاتھ نہ رہ سکا۔ وہ ہر سرب کے ساتھ اپنے خیال میں اپنی بیٹی کے پاؤں کی زنجیریں توڑ رہا تھا۔

ساری کوٹھی میں شور مچ گیا۔ کمروں کی جلیاں جل اٹھیں۔ نذر نے جلدی سے کپڑے پہن لئے۔ نوکر شور مچاتے بھاگتے اندر آ گئے اندر آ کر انہوں نے سینھ کی لاش کو خون میں لت پت چھلی چھلی دیکھا۔

”سینھ جی قتل ہو گئے۔“

ساری کوٹھی میں کھرام مچ گیا۔ سینھ کی بیوی نے مین کرنے شروع کر دیئے نوکروں نے علی اکبر اور نذر کو پکڑ لیا۔ پولیس کو فوراً فون کیا گیا۔ پولیس پانچ منٹ کے اندر اندر وہاں پہنچ گئی۔ علی اکبر اور نذر گرفتار کر لئے گئے اگلے روز کراچی کے اخباروں میں سینھ کے قتل کی بڑی بڑی سرخیاں جمائی گئیں۔

ساتھ ہی جمہور بائی کے قتل کی بھی خبر چھاپی گئی۔ قاتل نے ایک سوئے سے دونوں کو آدھ کھٹنے کے وقت کے بعد موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ شہر میں ہر شخص اس دوہرے قتل پر حیرت اور تعجب کا اظہار کر رہا تھا۔ علی اکبر کے دوست احمد مجسٹریٹ اور جاوید کو جب سینھ اور جمہور بائی کے قتل اور علی اکبر اور نذر کی گرفتاری کا علم ہوا تو وہ کہتے میں آ گئے۔

مجسٹریٹ احمد دوسرے ہی روز نذر کو ضمانت پر رہا کر دیا اپنے گھر لے آئے۔ علی اکبر نے دونوں قتلوں کا اعتراف کر لیا تھا۔ مقدمہ شروع ہو گیا۔ مجسٹریٹ احمد نے مقدمے کی پوری پوری



تو ہمیشہ بے چین رہتا ہے۔"

ملاقات کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نذر رو رہی تھی۔ جاوید نے اسے سنبھالا دیا اور وہ جیل سے باہر آ گئے۔ علی اکبر انہیں سلاخوں میں سے دور تک جاتے دیکھتا رہا۔

Waqar Azeem@pakistanipoint.com